اسلامی رواداری

قرآن وحدیث اور تاریخی شواہد کی روشنی میں

حسب ایماء

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ

تالیف

جناب مولانا شوکت علی قاسمی بستوی
ناظم عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ واستاذ دارالعلوم دیوبند

شائع کردہ

مرکزی دفتر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رائے گرامی

عالی قدر حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زید مجدہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر رابطۂ مدارسِ اسلامیہ عربیہ

حامداً و مصلیاً، أمّا بعد!

اسلام، اللہ رب العزت کا اپنے بندوں کے لیے پسندفرمودہ آخری اور کامل ومکمل مذہب ہے، جس کی تعلیمات میں جامعیت بھی ہے اور انفرادیت بھی، مذہبِ اسلام کی جو تعلیمات اس کے امتیاز کی علامت ہیں ان میں ایک مسلمان کے لیے دوسرے انسانوں بالخصوص دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور اخلاق و رواداری کے ساتھ پیش آنے کی تعلیم ،نہایت اہم ہے، جو اسلام کے آفاقی پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں عظیم کردار ادا کرسکتی ہے اور بلاشبہ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں ایسے خوبصورت نمونے پائے جاتے ہیں جن کی اقتداء کرکے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد میں امت کے علماء و اولیاء کرام نیز بادشاہان وسلاطینِ اسلام نے تاریخ کے صفحات پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے موضوعات پر حضراتِ علماء کی طرف سے مسلسل محنت ہو اور بہترین کام سامنے آئیں۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ جناب مولانا شوکت علی صاحب قاسمی بستوی استاذ دارالعلوم دیوبند و ناظم عمومی رابطۂ

مدارس اسلامیہ عربیہ نے اسلامی رواداری کے موضوع پر زیرنظر تحریر مرتب کر کے اس ضرورت کی بہترین تکمیل کی ہے، جس میں اس مضمون کے تمام ضروری گوشے سمیٹ لیے گئے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں موضوع کی وضاحت کے ساتھ تاریخی شواہد سے اس کے عملی نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ رب العزت اس رسالہ کو قبولِ عام عطا فرمائیں، آمین۔

والسلام

(حضرت مولانا مفتی) **ابوالقاسم نعمانی غفرلہ** (صاحب، زید مجدہم)

مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر رابطۂ مدارسِ اسلامیہ عربیہ

۲۵؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ

۱۷؍مارچ ۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریبِ اشاعت

اپنے محاسن اور دلوں کو موہ لینے والی تعلیمات، اپنی رواداری وانسانیت نوازی کی بناپر ساری دنیا بالخصوص یورپ وامریکہ میں اسلام کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے، بڑی تعداد میں عوام وخواص اسلام کے سایۂ عاطفت وعافیت میں آرہے ہیں، اسلام کی بے پناہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی سے گھبرا کر، اسلام کے قدم روکنے کے لیے شاطرانِ فرنگ نے دینِ اسلام کو بدنام کرنے کی مہم جاری کررکھی ہے، ساری دنیا اور خود ہمارے ملک میں اسلام کے خلاف شدومد سے پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اسلام تشدد کی ہمت افزائی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ، اسی طرح ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے بارے میں بھی تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے۔

حالاں کہ مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں نے ہندوستان کے اندر مساوات وہمدردی، اتحاد ویک جہتی، رواداری اور دل داری کی جو روشن مثالیں قائم کی ہیں وہ تاریخ ہند کا تابناک باب ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی، کہ عالمی اور ملکی پیمانہ پر اسلام اور مسلم حکمرانوں کے خلاف اس مکروہ پروپیگنڈے کے خلاف صحیح حقائق پیش کیے جائیں، قرآن وحدیث اور تاریخی واقعات وشواہد کی روشنی میں اسلام کی رواداری بیان کی جائے۔ زیرنظر رسالہ اسی سلسلے کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔

اس موقع پر گرامی قدر محترم حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زیدت معالیہم، مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ، کی خدمت میں

جذبات تشکر پیش کرنا بندہ اپنا خوش گوار فریضہ تصور کرتا ہے، جنھوں نے ۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ کو دارالعلوم دیوبند میں انعقاد پذیر مجلس عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ کے اجلاس کی تیاری کے سلسلہ میں منعقد مجلس (مورخہ: ۱۳/۴/۱۴۳۶ھ) میں شریک حضراتِ اساتذۂ کرام کی اس جیسے رسالے کی ترتیب وطباعت کی خواہش کے مطابق ناچیز کو اسلامی رواداری سے متعلق اس رسالہ کی ترتیب کے لیے مامور فرمایا اور رسالہ کو ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی رائے گرامی تحریر فرمائی جس سے رسالے کی قدر و قیمت میں گراں قدر اضافہ ہوا، بندہ حضرت والا کا بے حد ممنون وشکر گذار ہے۔

یہ رسالہ بہت کم وقت میں مرتب کیا گیا ہے، اس کی کتابت میں جناب مولوی محمد فردوس عالم بانکوی کارکن مرکزی دفتر رابطہ مدارس دارالعلوم دیوبند نے بڑا تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

رسالے کی اشاعت، ۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۴/ مارچ ۲۰۱۵ء کو دارالعلوم دیوبند میں انعقاد پذیر رابطہ مدارسِ اسلامیہ کے مجلس عمومی کے اجلاس کے موقع پر عمل میں آرہی ہے، یہ بڑی عجلت میں مرتب کیا گیا ہے، اگر کہیں فروگذاشت نظر آئے، تو قارئین کرام سے گذارش ہے ناچیز کو مطلع فرماکر شکر گذار فرمائیں؛ تاکہ اس کی اصلاح کردی جائے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادنیٰ سی کوشش کو قبولیت سے سرفراز فرمائے۔

شوکت علی قاسمی بستوی
استاذ دارالعلوم دیوبند
وناظم عمومی رابطۂ مدارسِ اسلامیہ عربیہ
۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ
۱۷/ مارچ ۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش گفتار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ أَجْمَعِیْنَ۔ أَمَّا بَعْدُ!

اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی اور جامع دستورِ حیات ہے، اس کی لازوال تعلیمات امن وامان، ہم دردی ورواداری، سلامتی اور عافیت کی ضامن ہیں اور دنیا وآخرت میں صلاح وفلاح اور سعادت اور کامرانی کا سرچشمہ ہیں، اسلام سراپا دینِ رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات رحمٰن ورحیم ہے، نبی آخر الزماں ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں؛ اس لیے ساری اسلامی تعلیمات محبت وشفقت اور رحمت ورأفت کا مظہر جمیل ہیں، اسلام کا پیغام عالم گیر ہے، وہ انسانیت کے لاینحل مسائل ومشکلات کا واحد حل ہے، سرکارِ دوعالم ﷺ محسنِ انسانیت اور رحمتِ عالم ہیں، آپ نے پوری انسانیت کو امن وسلامتی، اتحاد ویک جہتی، احترام انسانیت، وحدت ومساوات، ہمدردی ورواداری، عفو ودرگذر، رحم وکرم، عدل وانصاف، صلح وآشتی، سکون واطمینان، محبت والفت اور پرامن بقائے باہم کی تعلیم دی ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

نہ تو عرب کے لیے ہے نہ تو عجم کے لیے ۞ تو آستیں ہے زمانے کی چشم نم کے لیے

اپنی انھیں گوناگوں خصوصیات وامتیازات کے باعث اسلام تیزی سے پھیلا اور پھیلتا ہی چلا گیا اور اس کی ضیاپاش نورافشاں کرنوں نے دنیا کے چپے چپے کو منور کردیا، دنیا میں اسلام کی حیرت انگیز اشاعت، اس کی آفاقی صداقت اور گوناگوں خوبیوں کی رہینِ منت ہے، جس کا اعتراف غیر مسلم مفکرین اور مغربی دانشوروں نے بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر ڈبلیو آرنلڈ نے ''پریچنگ آف اسلام'' (دعوتِ اسلام) اسی موضوع پر لکھی ہے کہ ''اسلام کی اشاعت بزورِ شمشیر نہیں بلکہ صلح وآشتی کے ساتھ ہوئی۔

ڈاکٹر گستاولے بان فرانسیسی لکھتے ہیں:

''جس وقت ہم فتوحاتِ عرب پر نظر ڈالیں گے اور ان کی کامیابی کے اسباب کو ابھار کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اشاعتِ مذہب میں تلوار سے مطلق کام نہیں لیا گیا؛ کیوں کہ مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب میں آزاد چھوڑ دیتے تھے، اگر اقوام عیسوی نے اپنے فاتحین کے دین کو قبول کرلیا اور بالآخر ان کی زبان کو بھی اختیار کیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اپنے جدید حاکموں کو ان قدیم حاکموں سے جن کی حکومت میں اس وقت تک تھے بہت زیادہ منصف پایا، ان کے مذہب کو اپنے مذہب سے بہت زیادہ سچا اور سادہ پایا، یہ امر تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی مذہب بزورِ شمشیر نہیں پھیل سکتا، فی الواقع دینِ اسلام محض بہ ترغیب اور بزورِ تقریر شائع کیا گیا''۔ (نظامِ سلطنت: ۳۱۵۔ بہ حوالہ تمدنِ عرب)

مشہو مؤرخ مسٹر ولز کا بیان ہے کہ:

''اسلامی تعلیمات نے دنیا کے اندر منصفانہ اور شریفانہ طرزِ عمل کے لیے عظیم روایات چھوڑی ہیں اور وہ لوگوں میں شرافت اور رواداری کی روح پھونکتی ہیں، یہ تعلیمات بہت اونچی انسانی تعلیمات ہیں اور قابلِ عمل ہیں، ان تعلیمات نے ایک ایسی سوسائٹی کو جنم دیا جس میں اس کے پیشتر کی ہر سوسائٹی کے مقابلہ میں سنگ دلی اور اجتماعی ظلم کم سے کم رہا، اسلام نرمی، رواداری، خوش اخلاقی اور بھائی چارے سے پھیلا ہے''۔ (اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو، ص: ۱۲۸)

مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں:

''جب ہم اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی اپنی عیسائی رعیت کے اس قدر انصاف، عدل اور مذہبی رواداری کا مشاہدہ کرتے ہیں تو

واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا تلوار کے زور سے پھیلنے کا پروپیگنڈہ قابل تصدیق اور درخورِ اعتنا نہیں''۔ (ایضاً، ص: ۱۳۰)

مذکورہ بالا اعترافات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ اسلام میں موجود، بے پناہ کشش، جاذبیت اور مقناطیسیت کے باعث اسلام کی اشاعت عمل میں آئی ہے، اس میں جبر واکراہ، زور زبردستی اور ظلم وجبر کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں رہا ہے، لیکن دشمنانِ اسلام نے اسلام کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے پہلے بھی طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے اور اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی منصوبہ بند کوششیں جاری رکھیں اور آج بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرگرمِ عمل ہیں۔

اسلام اپنی مذکورہ بالا خوبیوں کے باعث یورپ میں بھی تیزی سے پھیلا، بڑی تعداد میں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونا شروع ہوئے، کیوں کہ اسلام ہی اہل یورپ کے دکھ کا درماں ہے اور زندگی کے مسائل ومشکلات کا واحد حل اور ان کا نجات دہندہ ثابت ہوا ہے۔

برنارڈ شا کے بقول:

''میں نے پیشین گوئی کی تھی کہ مستقبل میں محمد ﷺ کا دیا ہوا دین، یورپ میں مقبول ہوکر رہے گا۔ قرونِ وسطیٰ میں عیسائی مذہبی طبقہ نے اپنی ناواقفیت یا گھناؤنے تعصب کی بنا پر اسلام کی تصویر کو زیادہ سے زیادہ خوف ناک بنا کر پیش کیا، دراصل وہ محمد ﷺ اور ان کے دین سے نفرت میں حد سے تجاوز کر رہے تھے، وہ ان کو حضرت مسیح کا دشمن سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک یہ فرض ہے کہ محمد ﷺ کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیا جائے، مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ان جیسا آدمی آج دنیا کی قیادت سنبھال لے تو وہ یقیناً ساری مشکلات کے حل میں کامیاب ہو سکے گا اور دنیا کو امن وفلاح سے بہرہ یاب کر سکے گا۔ آج دنیا ان دونوں چیزوں کی کتنی زیادہ محتاج ہے''۔ (اسلام میں عدل اجتماعی، ص: ۴۶۳)

مغربی دنیا میں اسلام کی مقبولیت میں پچھلی صدی کی آخری دہائیوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے، کیوں کہ لوگ مغرب کی حیا سوز وخانہ برانداز تہذیب سے بیزار سے ہوگئے ہیں، دیگر ممالک میں بھی مختلف اسباب وعوامل کی بناء پر اسلامی بیداری کو فروغ ہوا ہے۔اس بات سے دشمنانِ اسلام کی نیندے اڑ گئی ہے، ان کو اسلام کا عروج اور مقبولیت کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی ہے، مغربی طاقتوں نے صہیونیوں کے زیرّ اثر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے منصوبہ بند مہم کو تیز کر دیا ہے ''اسلامی دہشت گردی''، ''اسلامی انتہا پسندی'' وغیرہ کی نئی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے اور پوری دنیا میں جنگی پیمانہ پر اسلام کے خلاف یہ منصوبہ بند مہم جاری ہے۔اسی دہشت گردی کا ہوّا کھڑا کر کے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، افغانستان کو تاخت وتاراج کیا گیا اور بعض دیگر مسلم ممالک پر شکنجہ کسنے کی تیاری جاری ہے۔اسلام کو آج سب سے بڑا خطرہ قرار دیا جارہا ہے، برطانیہ کی سابق وزیر اعظم ''مسز تھیچر'' نے ایک موقع پر کہا تھا کہ: اسلام کمیونزم سے زیادہ خطرناک ہے''۔

''تھیچر نے ۱۱ر ستمبر کے واقعہ کے بعد برطانوی اخبار ''گارجین'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ: اسلام ہی نیا انتہا پسند اشتراکی نظام ''بالشوازم'' ہے'' اسی کے ساتھ مسز تھیچر نے مغربی ممالک کو افریقہ، جنوب مشرقی ایشیاء، ایران، عراق، شام، لیبیا اور سوڈان میں اسلام کو شکست دینے کے لیے طاقت ور منصوبہ تیار کر کے نافذ کرنے کی دعوت دی''۔(بَعْدَ أحداثِ ۱۱/سبتمبر)

ایک اور مغربی لیڈر کا بیان ہے:

''آج ہم لوگوں کو حقیقی خطرہ اسلام سے ہے جو براہِ راست اور پوری شدت کے ساتھ ہمیں درپیش ہے، مسلمانوں کی دنیا ہماری دنیا سے بالکل الگ ہے، ان کی اپنی خاص روحانی تہذیب ہے، وہ حقیقی تاریخی تہذیب کے حامل ہیں''۔

(سالازار)(بَعْدَ أحداثِ ۱۱/سبتمبر)

۱۱ر ستمبر کے واقعہ کے بعد دشمنانِ اسلام کی مہم میں شدت اور جارحیت پیدا ہوگئی ہے، پوری شد ومد کے ساتھ یہودی، عیسائی اور ان کی ہم نوا طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کی کردارکشی، ان کی روشن اور تابناک شبیہ کو خراب اور داغ دار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، صہیونی اور امریکی طاقتوں نے اسلام اور دہشت گردی کو مرادف قرار دے دیا ہے۔دنیا میں کہیں بھی کوئی واقعہ تشدد پسندی کا رونما ہوتا ہے تو بغیر کسی ثبوت کے مسلمانوں کو بدنام کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔

۱۱ر ستمبر کے واقعہ کے بعد بھی اسلام مغرب میں برق رفتاری کے ساتھ پھیل رہا ہے، اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کے باوجود اسلام کے تئیں مطالعے میں وسعت نظر آرہی ہے۔

کیلیفورنیا کے مشہور اخبار ''لاس اینجلس ٹائمز'' کی رپورٹ اخبار کی سرخی میں کہا گیا ہے کہ امریکہ اور کناڈا میں دین اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلے میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیل رہا ہے، اخبار نے اپنے سرسری جائزے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد صرف امریکہ میں پانچ ملین (پچاس لاکھ) سے اوپر لکھی ہے۔(راشٹریہ سہارا اردو روزنامہ گورکھپور، ۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۴ء)

فرانس میں بھی اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہورہا ہے، جن میں ۶۷ فیصد خواتین باقی مرد ہیں۔ان میں سائنس داں، انجینئر، صحافی، سفارت کار، مبلغ پادری، دانش ور، مفکر، پروفیسر، وزیر، ماہر نفسیات، فلم اسٹار اور فوجی افسران شامل ہیں۔فرانسیسی وزارتِ داخلہ نے اپنی ایک رپورٹ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ جس محلّے میں مسلمان مساجد تعمیر کرتے ہیں جرائم حیرت انگیز حد تک کم ہوجاتے ہیں، فرانس کے ایک صنعتی شہر میں مسلمانوں نے وہاں کارپوریشن سے مسجد تعمیر کرنے کی اجازت طلب کی؛ لیکن شہر کے میر نے درخواست مسترد کردی، چار سال کا عرصہ

گذر گیا، اجازت نہیں ملی تو مسلمانوں نے ایک تجارتی کمپلیکس کے بڑے ہال میں نماز شروع کردی، فرانس کی خفیہ پولیس نے وزاتِ داخلہ کو رپورٹ دی کہ جب سے مسلمانوں نے یہاں نماز شروع کی ہے اُس وقت سے اِس علاقے میں جرائم کم ہوگئے ہیں، وزارتِ داخلہ نے سروے کرایا، تو یہ انکشاف ہوا کہ عام طور پر مساجد کی تعمیر کے بعد جرائم میں حیرت انگیز حد تک کمی آگئی ہے (قرآن نے اس حقیقت کو پہلے واشگاف کردیا تھا کہ: "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ۔")

اس رپورٹ کو بنیاد بنا کر فرانسیسی وزارت داخلہ نے مساجد کی تعمیر کی عام اجازت دے دی۔ (تعمیر حیات لکھنؤ۔ ۱۰؍جون ۲۰۰۱ء)

لندن ٹائمز نے ۹؍نومبر ۱۹۹۳ء کو ایک رپورٹ شائع کی کہ "مغربی میڈیا کے معاندانہ روِش کے باوجود، اسلام مغربی دلوں کو فتح کر رہا ہے"۔ (ایضاً)

"پیرس (ایجنسی) فرانس میں ایک متنازع میگزین پر حملے کے بعد اس ملک میں اسلام قبول کرنے والے افراد کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے، فرانس میں مساجد کے ائمہ کے مطابق ان کے پاس اسلام قبول کرنے کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھ کر دوگنی ہوگئی ہے۔ ایک نومسلم نے ایک ہفتہ قبل آر ٹی ایل ریڈیو کو اپنے قبول اسلام کے بارے میں اطلاع فراہم کرتے ہوئے کہا "اس واقعہ (شارلی ایبدو حملہ) نے مجھے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا؛ تاکہ میں یہ بتا سکوں کے اسلام وہ مذہب نہیں ہے جیسا کہ اس کے بارے میں منفی پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔" ار ٹی ایل ریڈیو کے مطابق محض پیرس کی گریٹ مسجد نے شارلی ایبدو پر حملے کے بعد ۴۰؍نومسلموں کو داخلِ اسلام ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کیا ہے۔ اتنے ہی عرصہ میں پیرس کی اس مسجد نے گزشتہ سال ۲۲؍افراد کے داخل اسلام ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے متنازع میگزین پر حملہ کے بعد اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھ کر دوگنی ہوئی ہے۔ پیرس کے

علاوہ اسٹراس برگ اور او برولرس میں بھی قبول اسلام میں ۳۰؍فی صد اضافہ ہوا ہے۔ جب کہ لیون میں ۲۰؍فی صد اضافہ درج کیا گیا ہے۔ مساجد کے ائمہ نے کہا کہ وہ قبول اسلام میں اضافہ سے حیران ہیں؛ کیوں کہ جو لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ان کا پس منظر بھی مختلف ہے۔ پیرس کی "گریٹ مسجد" میں اسلام قبول کرنے کے لیے آنے والوں میں ڈاکٹر، اسکول کے پرنسپل اور پولیس افسران سمیت دیگر افراد بھی شامل ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ شارلی ایبدو پر حملے کے فوری بعد فرنچ فلم ڈائریکٹر ایزابیل متک نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تھا۔" (انقلاب اردو روزنامہ، ۱۹؍فروری ۲۰۱۵ء)

صرف یورپ وامریکہ ہی نہیں بھید بھاؤ اور چھوت چھات کے خلاف اسلام کی روشن تعلیمات، اس کی انسان دوستی اور مساوات نے برصغیر میں بھی لوگوں کو بے حد متاثر کیا ہے، ماضی میں ہندوستان کے مختلف طبقوں کے لوگوں نے حضرات صوفیا کی انسان دوستی، غریب نوازی اور خدمت خلق سے متاثر ہوکر اسلام کے دامن میں پناہ لی اور برضا ورغبت اسلام قبول کیا، صوفیا کرام اور اکابر علماء دیوبند نے ہمیشہ اتحاد و یک جہتی کو فروغ دیا ہے، لیکن کچھ فرقہ پرست طاقتیں ملک میں سرگرم رہتی ہیں اور انہوں نے ملک کے مختلف باشندوں اور مذاہب کے لوگوں میں انتشار وافتراق پیدا کرنا چاہا اور اسلام اور مسلمانوں کی کردار کشی کی مہم جاری رکھی، اس کا سلسلہ آزادی سے قبل بھی جاری رہا اور آزادی کے بعد بھی قائم ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے اکابر علما کرام، مدارس اسلامیہ کے وابستہ حضرات اور عام مسلمانوں اور دیگر برادرانِ وطن کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں ملک آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوسکا، جنگ آزادی کا ایک تابناک پہلو یہ بھی تھا، کہ مسلم ہندو اور دیگر مذاہب کے ماننے والے ملک کی آزادی کے لیے تمام اختلافات کو نظرانداز کر کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوگئے تھے، اس ملک گیر اتحاد و یک جہتی نے انگریزوں کے

پنجۂ استبداد سے ملک کو واگذار کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

انگریزوں کی ہمیشہ یہ کوشش اور سازش رہی کہ ملک میں قومی اتحاد پروان نہ چڑھ سکے اور مختلف اقوام ایک دوسرے سے برسرِ پیکار اور نبرد آزما رہیں، چناں چہ کالے ٹیکس نے ایشیا ٹک جنرل میں لکھا تھا:

’’ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر شعبے کو چاہے وہ خارجی تعلقات سے وابستہ ہو یا عدالتی اور حربی نظم ونسق سے یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ تفرقہ ڈالو حکومت کرو‘‘۔ (حکومت خود اختیاری، ص:۵۲)

’’اس قدر وسیع ملک میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عمل داری میں جو بڑی جماعتیں ہیں، ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں، فرقوں اور قوموں میں ہوں، جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہیں گے، اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کر سکے گی‘‘۔ (کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم، مصنفہ، میجر باسو)

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انگریز مورخین نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ کو مسخ کیا، مسلم حکمرانوں کی کردار کشی کی مہم شروع کر دی گئی، نیز ۱۹۴۷ء کے بعد بھی ملک کے متعصب اور فرقہ پرست مورخین نے اپنی کتابوں میں ایسے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا، جس سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں دوری اور نفرت پیدا ہو، بعض مورخین نے لکھا کہ:

’’ہندوستان کے ہندو، مسلم فاتحین کی حکومت کو ناپسند کرتے رہے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ملیچھوں (یعنی مسلمانوں) کو اس دیس سے نکال کر اس ملک کو پھر آریہ دت بنا دیں (دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین لیول، ج:۶ر ص:۶۱۷، بہ حوالہ مذہبی رواداری، ج:۲ر ص:۱)

ہفتہ وار رسالہ سنڈے مورخہ ۳-۹ر اپریل ۱۹۸۳ء میں ایک مضمون شائع کیا گیا،

جس کا عنوان تھا ’’مسلمانوں کو ہندو بنا دیا جائے‘‘ کچھ تنظیمیں یہ تحریک چلاتی رہی ہیں کہ مسلمان اگر واقعی ملک کے وفادار ہیں، تو اپنا اسلامی نام بدل کر ہندوانہ نام رکھیں، عربی لکھنا پڑھنا چھوڑ دیں، اپنی زبان کے لیے ہندی رسم الخط اختیار کریں، مکہ، مدینہ کو اپنے ذہن سے نکال دیں، ہندوؤں کے تہوار کو قومی تہوار سمجھیں۔ (مذہبی رواداری)

فرقہ پرست طاقتیں دراصل ہندوستان میں اسپین کی تاریخ دہرانا چاہتی ہیں، مسلمانوں کے مذہبی آثار اور تاریخی مقامات کو سرزمینِ ہند سے مٹا ڈالنے اور مسلمانوں کو ظالم، غاصب اور دہشت گرد ثابت کرنے، مدارس اسلامیہ اور تبلیغی جماعت پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ آئے دن بعض شر پسند اور فرقہ پرست عناصر کی جانب سے سامنے آتا رہتا ہے، بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی غربت اور جہالت کا فائدہ اٹھا کر ’’گھر واپسی‘‘ کے نام پر ان کو مرتد بنانے کی کوششیں بھی جاری ہیں، اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ ملک کی اکثریت امن پسند سیکولر، اتحاد و یک جہتی کی داعی اور آپسی بھائی چارے کی خواہاں اور متمنی ہے، وہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی سابقہ روایات وخصوصیات کو پسند کرتے ہیں اور اسے فروغ دینا چاہتے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرقہ پرستی پچھلے چند سالوں میں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے، جب کہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ؛ بلکہ خطرناک ناسور فرقہ پرستی ہی ہے، بہ قول مہاتما گاندھی جی:

’’فرقہ پرستی انڈین یونین کی طاقت کے لیے ایک گھن ہوگا، جو صرف اقلیت ہی کو تباہ نہیں کرے گا؛ بلکہ اکثریت کو بھی بہت سے حصوں میں تقسیم کر دے گا اور ملک بجائے دو یا تین حصوں کے سینکڑوں حصوں میں منقسم ہو جائے گا اور یہ برّ اعظم ایشیا کا سرتاج، امریکہ اور روس کے مدمقابل بننے کے بجائے دوسروں کی امداد کا محتاج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ وہی طوقِ غلامی ہوگا جس کو تقریباً دو سو برس کی جدو جہد کے بعد ہندوستانیوں کے گلے سے نکالا گیا ہے۔‘‘ (خطبۂ صدارت، سولہواں اجلاس عام جمعیۃ لکھنو، ۱۹۴۹ء)

فرقہ پرستوں کی کے مذکورہ بالافرقہ وارانہ خیالات کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے ہی شروع ہوگیا تھا؛ لیکن اب ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے باعث ان میں مزید شدت آگئی ہے۔

فرقہ پرستی کے اس عفریت کو قابو میں کرنا ضروری ہے، اس کے لیے امن پسند، صلح جو، سیکولر کردار اور روایات کے، حامل ملک کے معزز افراد کو سامنے آنا ہوگا، علماءِ کرام، ملت اسلامیہ کے نمائندہ حضرات کا فرض یہ بھی ہے کہ گردوپیش کے موجودہ تشویش ناک حالات کے مقابلے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں، اور اس پریشان کن مسئلے کا کوئی حل تلاش کریں اور حالات کے مقابلہ کے لیے کوئی منظّم لائحۂ عمل تجویز کریں۔

اس سلسلے میں تین باتوں پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے:

(۱) یہ ہے کہ اپنے اندر اعتماد علی اللہ اور صبر واستقلال زیادہ سے زیادہ پیدا کریں، اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے سبق لیتے ہوئے اپنے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں کہ تکالیف ومصائب کے طوفان سے گذر کر بھی احساسِ کمتری، پامالی ومایوسی کا شکار نہ ہوں اور اس یقین میں کوئی تزلزل آئے، کہ اپنے وطنی زندگی میں جو بھی حوادث ومشکلات درپیش ہیں اور وہ بہر حال وقتی اور دنیوی مصائب ہیں اور ہمارا حقیقی اعتماد کارسازِ حقیقی کی رحمت اور اس کی رضا جوئی پر ہی ہے۔

(۲) علما کرام، ملّی قائدین، ملتِ اسلامیہ کی دینی، فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیں، تاکہ موجودہ عالمی اور ملکی حالات میں ملت کسی منفی سوچ، مایوسی یا احساس کمتری کا شکار نہ ہو؛ بلکہ مسلمانوں کو اپنے عقائد اور اعمال واخلاق میں سنتِ نبوی کی اتباع وپیروی کی تلقین کی جائے نیز یہ کہ ملت کسی بھی موقع پر جذباتیت کا شکار نہ ہو، مشکل سے مشکل حالات میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور صحابہ کرام اور دیگر اکابر واسلاف کی زندگیوں کو مشعلِ راہ بنائیں اور توکل اور انابت الی اللہ کو عزیز جانیں۔

(۳) اسلام کے پیامِ امن ورواداری کو عام کیا جائے اور قرآن وحدیث میں بیان کردہ پُر امن بقائے باہم کے اصول پر کاربند رہ کر ہندو مسلم اتحاد، خدمتِ خلق اور نفع رسانی کے لیے منظّم کام کیا جائے اور برادرانِ وطن اور ملک کے مختلف مذاہب کے افراد کے ساتھ بھائی چارے، اتحاد واتفاق، ہمدردی ورواداری کا معاملہ کیا جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی اور ہندوستانی تاریخ سے رواداری، رحم وکرم کے واقعات پر مشتمل رسائل اور کتابچے وغیرہ شائع کرائے جائیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچایا جائے اور یہ پیغام دیا جائے کہ مسلمان اس ملک میں کرایہ دار نہیں؛ بلکہ اس کے وفادار معمار رہے ہیں، ملک کے علمائے کرام، صوفیائے عظام اور مسلم حکمرانوں اور عوام نے ملک کی تعمیر وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھایا ہے۔

اسی جذبے کے تحت یہ رسالہ مرتب کیا گیا ہے، جس میں رواداری سے متعلق قرآن وسنت کے نصوص پیش کیے گئے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے اس کی روشن مثالیں دی گئی ہیں، اسی کے ساتھ انسانی حقوق کی حفاظت، غیر مسلموں کے بارے میں اسلامی تعلیمات بیان کی گئی ہیں، پھر مسلم سربراہانِ حکومت خصوصاً ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے رواداری کے واقعات رسالے میں شامل کیے گئے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو قبولیتِ عامہ سے سرفراز فرمائے اور اس کو مفید ونافع بنائے، آمین۔

رواداری کا مفہوم

رواداری کا لغوی مفہوم ہے، تحمل، برداشت، نرمی اور چشم پوشی۔

لیکن موجودہ استعمال کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ جولوگ آپ سے مذہب، تہذیب وثقافت یا رنگ ونسل میں اختلاف رکھتے ہوں اوران کے افکار ونظریات یا اعمال واخلاق کوآپ اپنے اعتبار سے ناپسند سمجھتے ہوں پھر بھی اگر وہ چیزیں ان کے مذہب وغیرہ کے اعتبار سے درست ہوں تو آپ ان کے عقائد وافکار وغیرہ کی مخالفت نہ کریں اور مذکورہ چیزوں میں ان سے اختلاف کے باوجودان کو برداشت کریں، ان کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ اور امتیازی سلوک نہ کیا جائے، ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے، اپنی رائے ظاہر کرنے سے روکا نہ جائے اور کسی طرح سے بھی ان پر کوئی تشدد نہ کیا جائے بلکہ ان کے ساتھ بھی عدل ومساوات، ہمدردی وغم گساری و یک جہتی ورواداری کا برتاؤ کیا جائے، ان کے انسانی اور شہری حقوق کا پاس ولحاظ رکھا جائے۔

اسلام سے پہلے رواداری کی صورتِ حال

اسلام سے پہلے عیسائی مذہب کی جو حالت تھی اور عیسائیوں نے اخوت ومساوات کو جس طرح سے پامال کیا تھا، اسکے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

قیصرِ قسطنطنیہ نے چھٹی صدی عیسوی کے درمیانی حصے میں یہ حکم نافذ کردیا تھا کہ جولوگ کیتھولک مذہب کی پیروی نہ کریں ان کو کوئی سرکاری عہدہ نہ دیا جائے۔

قیصر جارڈن نے بیس ہزار یہودیوں کو ملک شام سے جلا وطن اور ملک بدر کردیا تھا، یہودیوں اور غیر کیتھولک عیسائیوں کو اپنی کوئی مذہبی رسم قیصرِ روم کی عمل داری میں ادا کرنے اجازت نہیں تھی، ان کی مذہبی کتابیں چھین کر زبردستی جلا دی جاتی تھیں۔

۵۸۶ء میں تمام دنیا کے عیسائی علماء اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے کہ عورت میں روح ہے یا نہیں؟ آخر بڑے بحث ومباحثہ کے بعد کثرتِ رائے سے یہ بات طے ہوئی، کہ عورت میں روح ہے۔ (آئینۂ حقیقت نما، ص:۳۷)

ہندو مذہب کی رواداری کا حال ملاحظہ فرمائیں:

منوشاستر کی رو سے برہمن کا کام شاستر پڑھنا، پڑھانا، یگ کرنا، یگ کرانا، اعلیٰ ذاتوں کی پُروہتی کرنا اور تحائف لینا تھا، شودر اگر پکی ہوئی روٹی چھوڑ دے تو وہ پلید ہوجاتی تھی، شودر کو وید سننے کی بھی اجازت نہ تھی، اگر بلا ارادہ اس کے کان میں وید کے الفاظ پڑ جائیں تو اس کو نہایت اذیت کے ساتھ بہرا بنادینا ضروری تھا، دنیا میں کوئی چیز شودر کی ملکیت نہیں تھی، شودر کو جھوٹی خوراک کھانا، پرانے کپڑے پہننا اور نکما اسباب خانہ داری رکھنا ضروری تھا، شودر اگر برہمن یا چھتری کے بارے میں کوئی برا لفظ زبان سے نکالے تو اس کی زبان کاٹ لینے کا حکم تھا، کسی نیچی ذات کا آدمی اعلیٰ ذات کے آدمی کے ساتھ اس کی برابر بیٹھ جائے تو اس کی پیشانی پر داغ لگا کر اس کو جلاوطن کردینے یا اس کی پیٹھ سے ایک حصہ گوشت کا کاٹ ڈالنے کا حکم تھا۔ (ایضاً، ص:۳۶)

یجروید ادھیائے ۶ منتر بائیس میں حکم دیا گیا ہے:

"جو تم سے دشمنی رکھے یا جس سے تو دشمنی رکھو اسے زندہ حالت میں شیر اور درندوں کے منہ میں ٹھونس دو"۔

یہودیوں، پارسیوں اور دیگر مذاہب واقوام میں بھی رواداری کی صورت حال حد درجہ خراب تھی۔ (بہ حوالہ اسلامی رواداری)

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہم رقابت ومنافرت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں

کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ سن ۶۱۵ میں ایرانیوں نے شام کو فتح کیا تو یہودیوں کے مشورے اور ترغیب سے خسرو نے عیسائیوں پر وحشیانہ مظالم کیے اور بیشتر عیسائیوں کو تہہ تیغ کیا۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص: ۴۰۔۳۹)

اس عہد میں ذہنِ انسانی کند اور بنجر ہو چکا تھا، ایران اور بازنطینہ دونوں ملکوں میں عدمِ رواداری کا دور تھا، دونوں حکومتیں ایک نئے انداز کی مذہبی تھیں، جس میں آزادانہ اظہارِ خیال پر کڑے پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ (نبی رحمت، ص: ۵۷)

اسلام کی آفاقیت

اسلام عالمی اور آفاقی مذہب ہے، اس کی تعلیمات تمام افرادِ بشر کے لیے ہیں، اسلام کسی خاص طبقے، علاقے، تہذیب یا رنگ و نسل کے لوگوں کو مخاطب نہیں کرتا، بلکہ بہ یک وقت وہ تمام انسانوں سے خطاب کرتا ہے وہ سب کے لیے دینِ رحمت ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے جو نام بیان کیے گئے ہیں، ان میں بھی یہ بات جلوہ گر نظر آتی ہے، چناں چہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، حق تعالیٰ کے تین ناموں پر مشتمل ہے، پہلا نام ''اللہ'' ہے جس کا معنی ہے ذات واجب الوجود یا تمام انسانوں کا معبود حقیقی۔ دوسرا نام ''الرحمٰن'' ہے، یعنی وہ ذات جو سب پر مہربان ہے، عربی قاعدے سے ''رحمٰن'' کے معنی ہیں وہ ذات جس کی رحمت بہت وسیع (**Extensive**) ہو، یعنی اس رحمت کا فائدہ سب کو پہنچتا ہو...... اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں سب کو پہونچتی ہے جس سے مومن، کافر سب فیض یاب ہو کر رزق پاتے ہیں اور دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (توضیح القرآن، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی، ص: ۲۱۸)

تیسرا نام ''الرحیم'' ہے، اس کے معنی ہیں وہ ذات جس کی رحمت بہت زیادہ ہو، یعنی جس پر ہو مکمل طور پر ہو، پھر سورۂ فاتحہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے چند نام اور صفات مذکور ہیں، ان میں ''اللہ'' کے بعد ''رب العالمین'' ہے، جس کے

معنی ہیں، تمام جہانوں کا پروردگار۔ انسانوں کا جہان ہو یا جانوروں کا، جمادات کا جہان ہو یا نباتات کا، آسمانوں کا جہان ہو یا ستاروں، سیاروں اور فرشتوں کا سب کی تخلیق اور پرورش اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ (ایضاً)

پھر فرمایا: ''الرحمن الرحیم'' جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سب پر ہے اور بھرپور ہے۔

سورۂ اعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (سورۂ اعراف: ۱۵۶)

یعنی دنیا میں میری رحمت ہر مومن و کافر، نیک اور بد، سب پر چھائی ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں انہیں رزق اور صحت و عافیت کی نعمتیں ملتی رہتی ہے۔ (توضیح القرآن)

اسی طرح قرآن کریم نے خاتم الانبیاء والرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو سب جہانوں کے لیے رحمت قرار دیا ہے، ارشاد ربّانی ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ۔ (الانبیاء، آیت: ۱۰۷)

''اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

سورۂ احزاب میں فرمایا گیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب: ۲۱)

''حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔''

یعنی صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی عقائد و افکار، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، سیاست، معاشیات، میں اسوہ اور نمونہ ہے۔

خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''انما أنا رحمة مهداة''۔ (جامع صغیر رقم: ۲۵۸۳)

میں سراپا رحمت ہوں، اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔

قرآن کریم میں رواداری سے متعلق آیات

یَاأَیُّهَاالنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔ (حجرات،آیت:۱۳)

''اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں مختلف قوموں اور خان دانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرسکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، اللہ سب کچھ جاننے والا ہے، ہر چیز سے باخبر ہے۔''

اس آیت کریمہ نے مساوات کا یہ عظیم اصول بیان فرمایا ہے کہ کسی کی عزت اور شرافت کا معیار اس کی قوم، اس کا قبیلہ یا وطن نہیں ہے؛ بلکہ تقویٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ مختلف قبیلے، خان دان یا قومیں اس لیے نہیں بنائیں کہ وہ ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتائیں؛ بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ بے شمار انسانوں میں باہمی پہچان کے لیے کچھ تقسیم قائم ہوجائے۔ (توضیح القرآن)

(۲) یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ كُونُوا قَوَّامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَایَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَاتَعْدِلُوا، اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (مائدہ:۸)

ترجمہ: ''اے ایمان والے! ایسے بن جاؤ کہ اللہ (کے احکام کی پابندی) کے لیے ہر وقت تیار رہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ناانصافی کرو، انصاف سے کام لو، یہی طریقہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ یقیناً تمہارے تمام کام سے پوری طرح باخبر ہے''۔

رواداری کے سلسلہ میں یہ آیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے، کہ رواداری کو عدل

کا مترادف قرار دیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ مذہب، تہذیب، ثقافت، زبان یا رنگ و نسل میں اختلاف رکھنے والے ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ دوست ہو یا دشمن اس کے ساتھ آپ عدل وانصاف کا معاملہ کریں، اس کے مذہب وغیرہ کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے، نہ کسی طرح کی زیادتی یا ظلم روا رکھا جائے۔ آیت کریمہ کا مطلب یہی ہے کہ کسی قوم سے تمھاری عداوت اور دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو؛ بلکہ تم کو تو ہر حال میں انصاف ہی کرنا ہے۔

(۳) وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ (ہود:۱۱۸)

ترجمہ: ''اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طریقے کا پیرو بنادیتا (مگر کسی کو زبردستی، کسی دین پر مجبور کرنا حکمت کا تقاضا نہیں؛ اس لیے انہیں اپنے اختیار سے مختلف طریقے اپنانے کا موقع دیا گیا ہے) اور وہ اب ہمیشہ مختلف راستوں پر ہی رہیں گے''۔

آیت کریمہ میں جس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے وہ بھی رواداری کی ایک اہم بنیاد ہے کہ ہر شخص کے پیش نظر یہ بات رہنی چاہیے کہ مختلف طبقات میں جو مذہبی اور فکری اختلاف ہے وہ فطری ہے، اس کو ختم نہیں کیا سکتا ہے۔

اس لیے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا جائے اور دوسروں کے مذہب، عقائد ونظریات وغیرہ کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے اور ان کے ساتھ مذہبی، سیاسی، فکری اور علمی رواداری کا معاملہ کیا جائے۔

(٤) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ، الآیة۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

''اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی''۔

یعنی آدمی کو حسن صورت، نطق، تدبر اور عقل وحواس عنایت فرمائے جن سے دنیوی اور اخروی مضار ومنافع کو سمجھتا ہے اور اچھے برے میں تفریق کرتا ہے......

غرض نوع انسانی کو حق تعالیٰ نے کئی حیثیت سے عزت و بڑائی دے کر اپنی بہت بڑی مخلوق پر فضیلت دی۔ (تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ)

(۵) لَا اِکْرَاہَ فِیْ الدِّیْنِ، قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ (بقرہ:۲۵۶)

ترجمہ: دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں، ہدایت کا راستہ، گمراہی سے ممتاز ہوکر واضح ہو چکا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، کہ کسی پر مذہب اور عقیدے کو بدلنے میں زور زبردستی نہ کی جائے، اس کا تعلق دل اور ضمیر سے ہے، رواداری میں اس اصول کی بڑی اہمیت ہے۔

اسی حقیقت کو سورہ کافرون میں بھی بیان کیا گیا ہے:

(٦) لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔ (سورہ کافرون:٦)

ترجمہ: ''تمہارے لیے تمہارا دین ہے، میرے لیے میرا دین''۔

دوسری آیت میں ارشاد باری ہے:

(۷) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلَاغُ الْمُبِیْنِ۔ (النحل، آیت:۸۲)

ترجمہ: ''پھر بھی یہ کافر اگر منھ موڑتے رہیں تو (اے پیغمبر!) آپ کی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ واضح طریقے سے پیغام پہونچادو''۔ (توضیح القرآن)

یعنی اس قدر احسانات سن کر بھی خدا کے سامنے نہ جھکیں تو آپ کچھ غم نہ کھایئے، آپ اپنا فرض ادا کر چکے، کھول کھول تمام ضروری باتیں سنا دی گئیں، آگے ان کا معاملہ خدا کے سپرد کیجیے۔ (تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ)

حضرت فاروق اعظمؓ کا ایک غیر مسلم غلام تھا، جس کا نام وسق تھا، حضرت کی دلی خواہش تھی کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہوجائے تو اس کو کوئی ذمہ داری دے دی جائے، آپ نے اس سے بار بار اپنی خواہش کا اظہار بھی فرمایا، لیکن اس نے ہمیشہ انکار کیا، حضرت عمر اس کے انکار پر ہمیشہ یہی فرماتے: ''لَا اِکْرَاہَ فِیْ الدِّیْن'' پھر

آپ نے اسے آزاد بھی فرما دیا۔ (کتاب الاموال، ج:۱رص:۱۵۴)

(۸) اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل:۱۲۵)

ترجمہ: ''اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو''۔ (توضیح القرآن)

اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی رہتے ہیں تو مسلمانوں کو اس کی اور ہدایت ہے کہ وہ امن وسلامتی، عدل وانصاف، مساوات ورواداری، ہمدردی و یک جہتی، فیاضی اور انسانیت نوازی پر مشتمل اسلامی تعلیمات سے غیر مسلم حضرات کو روشناس کرائیں اور ان کو موثر نصیحت اور حکمت کے ساتھ دین کی دعوت پیش کریں؛ لیکن کسی طرح دباؤ بنانے اور زور وزبردستی کرنے کی کوشش نہ کی جائے، اگر وہ نہ مانیں اور مذہب کے سلسلہ میں مذاکرات اور بحث ومباحثہ کرنا چاہیں تو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مذہبی گفت وشنید ہونی چاہیے۔

(۹) قُلْ یَاأَهْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلیٰ کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَاوَبَیْنَکُمْ أنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّااللّٰهَ وَلَانُشْرِكَ بِهٖ شَیْئاً وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْ بِأنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران:٦۴)

ترجمہ: (مسلمانو!) ''یہود ونصاریٰ سے کہہ دو، اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہو (اور وہ یہ ہے) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں، پھر بھی اگر وہ منھ موڑیں تو کہہ دو کہ گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں''۔ (توضیح القرآن)

آیت کریمہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا گیا ہے کہ آپ اہل کتاب کو توحید خالص کی دعوت دیں جو مسلمان اور اہل کتاب میں ''قدر مشترک'' ہے۔

(۱۰) وَلَاتَسُبُّو الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوْ اللّٰهَ عَدْواً بِغَیْرِ

عِلُم ۔(الانعام:۱۰۸)

ترجمہ: (مسلمانو!) ''جن معبودوں کو یہ لوگ اللہ کے بجائے پکارتے ہیں تم ان کو برا نہ کہو، جس کے نتیجے میں یہ لوگ جہالت کے عالم میں حد سے آگے بڑھ کر اللہ کو برا کہنے لگیں''۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ کافروں کے سامنے ان کے معبودوں کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال نہ کریں، اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے، کافر لوگ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کر سکتے ہیں، اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کا سبب تم بنو گے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں خود گستاخی کرنا حرام ہے اسی طرح اس کا سبب بننا بھی ناجائز ہے۔(توضیح القرآن)

(۱۱) قُلُ لِعِبَادِیُ یَقُوُلُوا الَّتِیُ هِیَ أَحُسَن،اِنَّ الشَّیُطَانَ یَنُزَغُ بَیُنَهُمُ اِنَّ الشَّیُطَانَ کَانَ لِلُاِنُسَانِ خَذُوُلًا۔ (الاسراء:۵۳)

ترجمہ: ''میرے (مومن) بندوں سے کہہ دو کہ ایسی بات کیا کریں جو بہترین ہو، درحقیقت شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے، شیطان یقینی طور پر انسان کا کھلا دشمن ہے''۔

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ جب ان کے غیر مسلموں کے ساتھ گفتگو ہو تو ان کے ساتھ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ بات کیا کریں؛ کیوں کہ غصہ کے عالم میں سخت قسم کی باتوں سے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے اور ایسی باتیں شیطان اس سے کہلواتا ہے کہ ان سے فساد پیدا ہو۔(توضیح القرآن)

(۱۲) اِدُفَعُ بِالَّتِیُ هِیَ اَحُسَنُ، فَاِذَا الَّذِیُ بَیُنَكَ وَبَیُنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیُمٌ (سورۂ حم السجدۃ، آیت:۳۴)

ترجمہ: ''اس انداز سے آپ جواب دیجیے، جسے بہتر کہا جائے، آپ دیکھیں گے کہ جن کے اور آپ کے درمیان عداوت تھی وہ حمایتی دوست ہو جائیں گے''۔

(۱۳) وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الُجَاهِلُوُنَ قَالُوُا سَلَاماً۔ (الفرقان:۶۳)

اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو سلامتی کی بات کہتے ہیں۔

یعنی ان کی بدکلامی اور گالی گفتار کا جواب بُرے الفاظ میں دینے کے بجائے شریفانہ انداز میں دیتے ہیں''۔(توضیح القرآن)

یہاں نمونے کے طور پر صرف چند آیات اور ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، ورنہ جن آیتوں میں عدل وانصاف، رواداری اور انسانی حقوق کی رعایت کا حکم ہے وہ خاصّی ہیں۔

رواداری سے متعلق احادیث مبارکہ

(۱) ترجمۂ حدیث: ''(افضل ترین ایمان یہ ہے کہ) تم لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو اور ان کے لیے وہی چیزیں ناپسند سمجھو جو تم خود اپنے لیے ناپسند سمجھتے ہو''۔(ترغیب وترہیب، ج:۴،ص:۴۸)

(۲) ترجمۂ حدیث: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اللہ سے ڈرو جہاں کہیں بھی ہو اور برائی کے بعد اچھائی کر دو کہ وہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ''۔(سنن ترمذیؒ:۱۹۸۷)

حسنِ اخلاق سے پیش آنے کا حکم تمام لوگوں کے ساتھ دیا گیا ہے چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اور حسنِ اخلاق میں قولی وفعلی دونوں طرح کے اچھے اخلاق شامل ہوتے ہیں۔

(۳) ترجمۂ حدیث: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ مہربان ہیں، مہربانی (اور نرمی) کو پسند فرماتے ہیں اور نرمی پر اتنا دیتے ہیں جتنا سختی پر نہیں دیتے، اور کسی اور چیز پر بھی نہیں دیتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

مہربانی کو لازم کرلو اور سختی اور فحش گوئی سے اجتناب برتو، نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے اس کو خوبصورت بنا دیتی ہے اور جس چیز سے ہٹا دی جائے اس کو بدنما بنا دیتی ہے''۔(مشکاۃ شریف،ص:۴۳۱)

(۴) ترجمۂ حدیث:''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کا نام لے کر اور اس کے سہارے روانہ ہو جاؤ اور اللہ کے رسول کی ملت پر قائم رہو، کسی بہت بوڑھے شخص، بچے، نابالغ اور عورت کو قتل مت کرنا، مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا، مال غنیمت ایک ساتھ جمع کر لینا، آپس میں معاملات درست رکھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنا، بے شک اللہ تعالیٰ اچھا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے''۔(شرح فتح القدیر، ج:۴،ص:۴۳۶)

یہ وہ وصیت ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں سے مقابلہ کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو روانہ فرماتے وقت ارشاد فرما رہے ہیں، اس میں دشمنوں اور غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف کرنے اور ظلم وزیادتی سے اجتناب کرتے رہنے کا حکم دیا جارہا ہے۔

(۵) ترجمۂ حدیث:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کرے یا اس کے حق میں کمی کرے یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو قیامت کے روز میں اس کا وکیل ہوں گا (کہ بارگاہِ الٰہی میں اس کا مقدمہ پیش کروں گا)''۔(کنز العمال، ج:۲،ص:۲۷۰)

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۶) ترجمۂ حدیث:''جس شخص نے نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک بھی نہ سونگھ سکے گا، حالاں کہ اس کی خوشبو اتنی دور سے پہنچتی ہے کہ اس

کی مسافت چالیس برس میں قطع کی جاسکتی ہے۔(بخاری،نسائی،ابن ماجہ،مسند احمد عن ابن عمرو)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۷) ترجمۂ حدیث:''مجھے میرے پروردگار نے منع کیا ہے، کہ میں کسی معاہد پر یا کسی دوسرے شخص پر ظلم کروں''۔(مستدرک حاکم عن علی۔کنز،ص:۲۷۰،ج:۲)

ارشاد نبوی ہے:

(۸) ترجمۂ حدیث:''امید ہے کہ تم ایسی اقوام سے جہاد کروگے جن پر تمہیں غلبہ حاصل ہوگا اور وہ لوگ اپنے مال اور اولاد کی حفاظت کے لیے تم سے صلح جوئی کریں گے، ان سے بجز اس مال کے جو عہد صلح کے وقت طے ہو جائے کوئی چیز نہ لو''۔(ابوداؤد)

(۹) ترجمۂ حدیث:''حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں کہ عہد رسالت ﷺ میں میری ماں جو کہ مشرکہ تھیں، میرے پاس آئیں، میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں، کیا میں اپنی (غیر مسلم) ماں کے ساتھ حسن سلوک کروں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، تم اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو''۔(صحیح بخاری کتاب الادب)

(۱۰) ترجمۂ حدیث:''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم مومن نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم مومن نہیں ہوسکتا، خدا کی قسم مومن نہیں ہوسکتا، عرض کیا گیا کہ کون یا رسول اللہؐ؟ فرمایا: جس کا پڑوسی اس کی تکلیفوں سے محفوظ نہ ہو''۔(مشکاۃ:۴۲۲)

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی سخت تاکید ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ایک اور حدیث شریف میں ارشاد فرمایا:

ترجمۂ حدیث:'' ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال

ہمارے مال کی طرح ہیں۔(نصب الرایہ،ج:۴/۳۶۹)

غیر مسلموں کی جان و مال کو اتنی اہمیت دی گئی ہے جو مسلمانوں کے جان و مال کو حاصل ہے۔

ترجمۂ حدیث:''حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک غیر مسلم ذمی کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا۔

(مصنف عبدالرزاق،ج:۱۰/ص:۱۰۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃٌ للعالمینی

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے رحمت للعالمین قرار دیا ہے، یہ لقب اور شرف ایسا ہے جو کسی اور کے لیے استعمال نہیں کیا گیا، سچ ہے ؎

آئے دنیا میں بہت پاک و مکرم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالم بن کر

رحمۃٌ للعالمین وہی عظیم ترین شخصیت قرار پائے گی، جس نے امنِ عالم کے قیام واستحکام کے لیے ساری زندگی صرف کی ہو، جس نے بندوں کو خدا سے ملایا ہو، جس نے غریبی وامیری، جوانی وپیری، امن اور جنگ، رنج وراحت، حزن ومسرت، ہر موقع اور مقام پر انسانیت کی رہ نمائی کی ہو، جس کی تعلیم نے درندوں کو چوپانی، بھیڑیوں کو گلّہ بانی، رہزنوں کو جہاں بانی، غلاموں کو سلطانی، شاہوں کو اخوانی سکھائی ہو، جس نے تمام افرادِ بشر کو بھائی بھائی قرار دیا ہو، جانی دشمنوں کو پروانۂ امن وامان عطا کیا ہو، غیر مسلم ذمیوں کو جان ومال، عزت وآبرو اور دیگر حقوقِ انسانی کی حفاظت میں مسلمانوں کے ہم پلّہ اور مساوی قرار دیا ہو، رحمۃ للعالمین وہی ہے جس نے تمام بنی نوع انساں کو انسانی، قومی، قانونی اور مالی مساوات کا درس دیا ہو، جس نے یہودیوں، عیسائیوں، منافقین اور تمام مخالفین کیساتھ بے نظیر رواداری اور عدل وانصاف کا

معاملہ کیا ہو اور ان کے ہر طرح کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت دی ہو، جس نے انسانوں کے تمام طبقات، امیر وغریب، عوام وخواص، بوڑھوں، بچوں، جوانوں، مردوں، عورتوں، نیک وبد، محنت کشوں، مزدوروں، غلاموں، کنیزوں کے ساتھ رواداری وغم گساری، مساوات وہم دردی کے جذبات سے معاشرے کو آراستہ کیا ہو۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ رواداری، مساوات وہمدردی اور غم خواری وغم گساری، عفو ودرگذر اور رحم وکرم کے واقعات سے معمور نظر آتی ہے۔

عام انسانوں کی خدمت ان کی حاجت روائی اور اشک شوئی سے سرکارِ دوعالم کو بڑی دل چسپی رہی، خدمتِ خلق چوں کہ دعوت کا راستہ ہموار کرتی ہے، دلوں کے بند دروازے کھولتی ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبوت دینے سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ کو خدمتِ خلق کی تربیت دی۔

خدمتِ خلق کے دائرے میں سرکارِ دوعالم ﷺ نے رشتہ داروں کا ہمیشہ خیال رکھا، ان کے ساتھ حسبِ مراتب معاملہ کیا، ان کے حقوق کی ادائیگی میں پیش پیش رہے، یتیموں، بیواؤں اور بے نواؤں کی خبر گیری کی اور ان کی امداد فرمائی، بے روزگاروں کی مالی مدد اور مظلوموں، مصیبت زدہ لوگوں کی دستگیری فرمائی اور نبوت کے ساتھ سرفراز کیے جانے سے پہلے بھی مکہ میں امن وامان کے قیام کے لیے کی جانے والی جدوجہد میں برابر شریک رہے۔

پہلی وحی کے نزول کے وقت جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اضطراب کی خاص کیفیت طاری ہوئی تو آپ اپنی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور غارِ حرا میں حضرت جبرئیل کے آنے اور سورۂ اقراء کی ابتدائی آیات کے نازل ہونے کا تذکرہ کیا اور یہ فرمایا، کہ مجھے اپنے اوپر ڈر لگ رہا

ہے، یہ واقعہ میرے لیے ناقابلِ برداشت سا ہے، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی دیتے ہوئے حضورؐ کے اخلاق کریمانہ اور بندگانِ الٰہی کی خدمت کے وہ کام یاددلائے جو آپؐ انجام دیتے تھے۔فرمایا:

"کلّا واللّٰہِ لَایُخزِیكَ اللّٰهُ أبدا، انّك لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحمِلُ الكلّ وَتُكسِبُ المَعدُوم وتَقرِیَ الضَّیفَ وتُعین علی نَوائب الحقِّ"۔

اللہ کی قسم! اللہ آپ کو بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور آسمانی حوادث میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔(بخاری شریف)

امن وامان کے قیام واستحکام کے لیے معاہدے

حلف الفضول: حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اور اس سے پہلے مکہ کے حالات نہایت پُرآشوت تھے، جنگ وجدال کا بازار گرم تھا، دوسروں پر ظلم ایک عام بات تھی، زبیدی نام کا ایک تاجر مکہ میں آیا، قریش کے سردار عاص بن وائل نے اس سے سامانِ تجارت خریدا اور اس کا پورا حق اسے نہیں دیا، زبیدی نے اہل مکہ سے فریاد کی، کچھ لوگوں کو اس مظلوم پر رحم آیا اور انہوں نے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوکر ایک معاہدہ کیا کہ مکہ کی سرزمین پر اب ظلم نہیں ہونے دیا جائے گا، مظلوم کی مدد کی جائے گی اور ظالم کو ظلم سے روکا جائے گا، اس معاہدے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی شامل تھی، باقی جو لوگ تھے ان میں فضیل بن حارث، فضیل بن ودعۃ اور مفضل نامی افراد تھے، اس لیے اس کا نام حلف الفضول رکھ دیا گیا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آج بھی کوئی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے، مظلوموں کی مدد کرنے کے لیے معاہدہ کرے تو سب سے پہلے میں اس میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوں۔(تفسیر ابن کثیر، ج:۱ص:۲۵۸)

میثاقِ مدینہ

مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی استحکام اور تمدنی واجتماعی نظم کی تکمیل کے لیے ایک تاریخی معاہدہ کی دفعات طے فرمائیں، جس میں مسلمانوں اور دیگر باشندگانِ مدینہ کی مشترک دینی، سیاسی، اور تمدنی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل کو ملحوظ رکھا گیا اور اقلیتوں کے تحفظ اور ان کے ساتھ اشتراک وتعاون کے لیے حسب ذیل دفعات شامل فرمائی گئیں۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک معاہدہ ہے جو مسلمانانِ قریش، مسلمانانِ مدینہ اور ان لوگوں کے درمیان نافذ ہوگا جو مذکورہ جماعتوں کے ساتھ متفق وحلیف بن گئے ہیں اور ان کے ساتھ محاربات میں شریک رہے ہیں۔

۱۔ یہ تمام معاہد جماعتیں (قریش، مہاجرین، انصار، یہود معاہدین) دوسری غیر مسلم غیر معاہد جماعتوں کے مقابلہ میں ایک جماعت اور ایک قوم شمار ہوں گی۔

۲۔ مہاجرینِ قریش بجائے خود ایک جماعت ہیں اور وہ اپنے مجرموں کی جانب سے دیت کے ذمہ دار ہوں گے اور اپنے قیدیوں کا فدیہ خود ادا کرکے چھڑائیں گے، یہ سب کام ایمان وانصاف کے اصول کے ماتحت ہوں گے۔

اس کے بعد انصار کے مختلف قبائل کے نام مثلاً بنی عوف، بنی ساعدہ، بنی الحارث، بنی جشم، بنی النجار وغیرہم کے نام لے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک کے متعلق یہی ذکر فرمایا کہ ان میں سے ہر قبیلہ بجائے خود ایک جماعت ہے اور وہی اپنے مجرموں کی جانب سے ادائے دیت اور فداء اسیر ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا اور یہ تمام کام اصول دیانت وانصاف کے ماتحت انجام پائیں گے۔

۳۔ مسلمانوں کا کوئی مفلس شخص اگر کوئی ایسا جرم کرلے جس پر دیت واجب ہوتی ہے یا قید ہوجائے اور فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہوتو دوسرے مسلمانوں کو لازم ہوگا کہ وہ اس کی جانب سے دیت ادا کریں یا اس کا فدیہ ادا کرکے اس کو چھڑائیں، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو، صرف اسلام میں شریک ہو۔

۴۔ مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو کہ فتنہ وفساد برپا کرتا اور مخلوق سے ظلماً تاوان وصول کرتا ہو اور خلق خدا کو ستاتا ہو، تمام مسلمانوں کو متفق ہوکر اس کے خلاف کام کرنا لازم ہے، اگر چہ وہ ان میں سے کسی کا لڑکا ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم محارب کو مدد دے اور اس کی اعانت کرے۔

۶۔ خدا تعالیٰ کی پناہ اور ذمہ داری اور عہد ایک ہے، یعنی اگر کسی ایمان دار بندے نے کسی کو خدا کی پناہ دی تو دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کا پورا کرنا لازم ہے، خواہ وہ پناہ دینے والا ادنیٰ درجہ کا مسلمان کیوں نہ ہو۔

۷۔ اگر کوئی قوم مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف برسرِ پیکار ہوتو مسلمانوں کو مسلمانوں کی اعانت ضروری ہے۔

۸۔ جن یہودیوں نے ہمارے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مدد اور ان کے ساتھ مواسات (خیرخواہی وحسن سلوک) کا برتاؤ کریں، ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ ان کے خلاف کسی ظالم کی مدد کی جائے۔

۹۔ چوں کہ تمام مسلمانوں کی صلح ایک ہے؛ اس لیے کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ صرف اپنی رائے سے کسی قوم کے ساتھ بدون مشورہ باقی مسلمانوں

کے صلح کرلے؛ مگر جب کہ اس نے تمام قوم کے رجحان اور تمام قوم کے ساتھ انصاف اور مراعات حقوق کا لحاظ کرلیا ہوتو خیر۔

۱۰۔ مسلمانوں کو پابندیٔ عہد میں اعلیٰ مقام پر رہنا اور ارفع ترین مکارم اخلاق کا ثبوت دینا اسلامی فریضہ ہے۔

۱۱۔ جن مسلمانوں نے اس معاہدہ کو مان کر اس کی پابندی کا اقرار کرلیا ہے اور خدائے قدوس پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ وہ اس کی دفعات میں تغیر یا کوئی نئی بات پیدا کریں اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے معاملہ رکھیں جو عہد نامہ ہذا کا احترام نہ کرتا ہو۔

۱۲۔ اگر کسی امر میں تمہارے آپس میں اختلاف ہوجائے تو خدا (قرآن مجید) اور رسول (حدیث شریف) کی طرف رجوع کرکے اس کا فیصلہ کرالو۔

۱۳۔ اس معاہدے کے بعد یہود پر بھی لازم ہوگا کہ وہ مسلمانوں کی اس وقت مالی امداد کریں جب کہ وہ کسی قوم کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں۔

۱۴۔ یہود بنی عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں، یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے، مذہب کے سوا باقی امور میں مسلمان اور یہود بنی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے، ہاں جو ظلم اور عہد شکنی یا کوئی جرم کرے گا وہ اس کی جزا کا مستحق ہوگا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ نے یہود کی دوسری جماعتوں کے نام لے کر مثلاً یہود بنی النجار، یہود بنی الحاذ، یہود بنی ساعدہ، یہود بنی جشم، یہود بنی الاوس کے متعلق بھی تصریح فرمادی کہ ان تمام یہود کے (چوں کہ سب نے معاہدہ قبول کرلیا تھا) یہود بنی عوف کی طرح حقوق ہوں گے۔

۱۵۔ اگر مسلمان اور یہود معاہدین کے خلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہوکر لڑنا ہوگا اور مسلمان لشکر اپنے مصارف کا اور یہود

لشکر اپنے مصارف کا ذمہ دار ہوگا۔

۱۶۔ معاہد فریقین پر لازم ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ خلوص اور خیر خواہی کا برتاؤ کریں اور کوئی معاہد اپنے معاہد کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہ کرے اور مظلوم کی مدد کی جائے۔

۱۷۔ اپنے پڑوسیوں کو اپنی جان کے برابر سمجھو، بشرطے کہ وہ پڑوسی مضرت رسانی اور جرائم کا ارتکاب نہ کریں۔

۱۸۔ اگر کوئی عورت بھاگ کر آجائے تو اس کو اس کے اعزاء کی اجازت کے بغیر پناہ میں نہ لیا جائے۔

اس تاریخی معاہدے نے مدینہ منورہ میں امن وامان کے استحکام اور باشندگانِ مدینہ کی اکثریت اور اقلیتوں کے شہری وتمدنی حقوق وفرائض اور آپسی اشتراکِ عمل اور پُرامن بقائے باہم کے لیے ماحول نہایت سازگار بنادیا، یہ سرکارِ دوعالم کی رواداری کی اور سیاسی تدبر کی بہترین مثال ہے۔(اسلام میں عہد کی پاسداری)

کفار ومشرکین کے ساتھ رواداری

(۱) کفار ومشرکین کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری اور حسن سلوک کی ایک بہترین مثال طائف کے سفر میں نظر آتی ہے، جب کفار مکہ نے ظلم وزیادتی کی حد کردی تھی، مکہ کی سرزمین اسلام کے لیے وسعت کے باوجود تنگ سے تنگ ہوتی گئی،تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا دعوتی سفر فرمایا اور قبیلۂ بنوثقیف کے سربراہان سے گفت گو کی، انہوں نے منفی جواب دیا؛ بلکہ مذاق اڑایا، طائف کے اوباش اور غنڈوں کو آپ کے پیچھے لگادیا گیا، ان بدمعاشوں نے پتھر مار مارکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لہولہان کردیا، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب آپ سے ان مشرکین کے لیے بددعا کی درخواست کی تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: مجھے لعنت کرنے والا بناکر نہیں بھیجا گیا ہے؛ بلکہ دین اسلام کی دعوت دینے والا اور سراپا رحمت بناکر بھیجا گیا ہے، اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرماکر کہ وہ (مجھے) جانتے نہیں۔(شفا: قاضی عیاض،ص:۷۴، بہ حوالہ رحمتِ عالمؐ)

(۲) اسی طرح سن ۶ رہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرے کے لیے مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا، ۱۴۰۰رصحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ تھے، کفارِ مکہ نے آپ کو مکے میں داخل ہونے سے روک دیا، قریش کے نمائندوں سے مذاکرات ہوئے اور صحابہ کرام کے دلی جذبات کے برعکس صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہوا، جس میں دس سال کے لیے جنگ بندی ہوئی، طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں گے، اگلے سال آئیں گے اور عمرہ کریں گے، تین دن قیام کرکے واپس ہوجائیں گے، ہمارا کوئی آدمی جنگ بندی کے دوران آپ سے آکر ملے گا تو آپ اس کو واپس کردیں گے، آپ کا کوئی آدمی ہمارے یہاں آتا ہے، تو ہم پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی، حضرت علیؓ کو معاہدے کی دفعات لکھنے کے لیے طلب کیا گیا، انہوں نے جب یہ عبارت لکھی کہ: یہ وہ معاہدہ ہے، جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پارہا ہے، سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو رسول مانتے تو جھگڑا ہی کچھ نہ تھا، محمد بن عبداللہ لکھیے، آپ نے حضرت علی سے فرمایا: ’’رسول اللہ‘‘ کا لفظ کاٹ دو، انہوں نے عرض کیا میں یہ جرأت کیسے کرسکتا ہوں، آپ نے عہد نامے سے ’’رسول اللہ‘‘ کا لفظ خود ہی کاٹ دیا، اور فرمایا اب آگے لکھو!۔ معاہدہ لکھا ہی جارہا تھا کہ سہیل کے صاحبزادے ابوجندلؓ جو مسلمان تھے کسی طرح مکّے سے بھاگ کر حدیبیہ پہونچ گئے؛ تاکہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوجائیں، سہیل نے انہیں مارا اور واپس لے جانے کا مطالبہ کیا، ہر چند کہ مسلمان اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ انہیں واپس نہ جانے دیا جائے، لیکن آپ نے سہیل کے شدید اصرار پر ان کو واپس جانے دیا۔

کیا دوسروں کے جذبات کے لحاظ اور فیاضی ورواداری کہ ایسی کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے؟

(۳)اس سلسلے میں حضرت ثمامہؓ بن اثال کا واقعہ ہے۔حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک لشکر کو نجد کے علاقے کی طرف روانہ فرمایا جو واپسی میں اپنے ساتھ قبیلۂ بنوحنیفہ کے ایک آدمی ثمامہؓ بن اثال کو قیدی بنا کر لائے اور اسے مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: اے ثمامہ! تمہارے پاس کہنے کو کیا ہے؟ اس نے کہا: اے محمد! میرے پاس کہنے کو اچھی بات ہے، اگر آپ مجھے قتل کرتے ہیں تو ایسے شخص کو قتل کریں گے جو سزا کا واقعی مستحق ہے اور اگر آپ مجھ پر احسان کرتے ہیں تو ایسے شخص پر احسان کرتے ہیں، جو محسنوں کا شکرگزار رہتا ہے، اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدلے میں مال چاہیے تو مجھ سے بتائیں؛ تاکہ آپ ﷺ کا مطالبہ پورا کردیا جائے'' آپ ﷺ نے یہ سن کر اُسے اسی حالت میں چھوڑ دیا، اگلے دن آپ ﷺ نے پھر اسے یہی سوال کیا اور اس نے وہی جواب دیا، اس کے بعد آپ ﷺ نے پھر اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا، پھر تیسرے دن بھی آپ ﷺ نے اس سے یہی سوال کیا، جس پر اس نے وہی جواب دیا، آپ ﷺ نے اس کے بعد حکم فرمایا کہ ثمامہ کو آزاد کردیا جائے، ثمامہ وہاں سے نکل کر مسجد نبوی کے قریب ہی ایک نخلستان میں گئے اور غسل کیا، پھر واپس مسجدِ نبوی لوٹ آئے اور بلند آواز میں کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! روئے زمین میں مجھے سب سے زیادہ آپ ﷺ کے چہرے سے نفرت تھی؛ لیکن اب یہی چہرا میرا محبوب ترین چہرا ہے۔روئے زمین میں مجھے سب سے زیادہ نفرت آپ ﷺ کے شہر سے تھی؛ لیکن اب یہی شہر میرا محبوب ترین شہر ہے۔آپ ﷺ کے لشکر نے مجھے

اُس وقت گرفتار کیا تھا جب کہ میں عمرے کی نیت سے جارہا تھا، اب مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں''۔اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں بشارتیں دیں اور عمرہ ادا کرنے کا حکم فرمایا، جب حضرت ثمامہؓ مکہ پہنچے تو کسی نے طنز کیا کہ تم تو بے دین ہوگئے ہو، انہوں نے جواب دیا کہ نہیں! بلکہ میں محمد رسول اللہ ﷺ پر اسلام لایا ہوں اور خدا کی قسم! اب تمہارے پاس علاقۂ یمامہ سے گیہوں کا ایک دانہ بھی نہ آئے گا؛ تاآں کہ اللہ کے رسول ﷺ ہی اس کی اجازت مرحمت نہ فرمادیں۔''

ثمامہؓ نے اپنے وطن پہنچ کر مکہ بھیجا جانے والا اناج بند کردیا، اہل مکہ قحط سے بلبلا اٹھے، انہوں نے سرورِ عالم سے درخواست کی کہ غلہ جاری کرادیا جائے، آپؐ نے ثمامہ کو لکھا کہ غلہ بدستور مکہ بھیجا کریں۔(بخاری شریف، کتاب المغازی)

(۴) جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: ''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نجد کی طرف لشکر کشی کی، راستے میں دوپہر کا وقت ہوا اور آرام کی ضرورت محسوس ہوئی، اس علاقے میں کثرت سے جھاڑیاں تھیں، آپ ببول کے ایک درخت کے سایے میں استراحت فرمانے لگے اور اپنی تلوار درخت پر لٹکا دی اور لوگ بھی منتشر ہوکر مختلف درختوں کے نیچے پناہ گیر ہوگئے، یہ کیفیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں آواز دی، ہم حاضر خدمت ہوئے، تو دیکھا کہ ایک اعرابی آپ ﷺ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں سورہا تھا کہ یہ شخص آیا اور میری تلوار کھینچ لی، میں بیدار ہوا تو یہ تلوار کھینچے ہوئے میرے سر پر کھڑا تھا، اس نے کہا تمہیں مجھ سے کون بچاسکتا ہے؟ میں نے کہا اللہ! اس نے تلوار نیام میں کرلی، اس کے بعد بیٹھ گیا اور یہ وہ شخص جو تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہے'' راوی بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کوئی سزا نہیں دی۔(صحیح بخاری، کتاب المغازی)

(۵) سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نوازش وکرم اور بڑے سے بڑے دشمن کے ساتھ دلداری اور احسان کا ایک نمونہ وہ تھا، جب منافقین کے سردار عبداللہ بن

اُبی بن سلول کو قبر میں اتارا گیا، آپ ﷺ وہاں تشریف لائے، حکم دیا کہ اس کو قبر سے نکالا جائے، اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کو اپنے گھٹنوں پر رکھا اور اپنا لعاب دہن اس پر ڈالا اور اپنی قمیص مُبارک اس کو پہنائی۔ (صحیح بخاری، کتاب الجنائز)

(۶) انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ''میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا، آپ ﷺ نے اس وقت نجران کی چادر زیب تن کیے ہوئے تھے، جس کے کنارے موٹے تھے، راستے میں ایک اعرابی آپ ﷺ کو ملا اور آپؐ کی چادر مبارک پکڑ کر زور سے کھینچی، میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آپؐ کی گردن پر اس کے کھینچنے کی وجہ سے نشان پڑ گئے ہیں، پھر اس اعرابی نے کہا، محمد! اللہ کا جو مال تمہارے پاس ہے وہ مجھے دینے کا حکم کیجیے، آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا، ہنسے، ہدایت کی کہ اس کو مال دیا جائے۔ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد)

(۷) کفار و مشرکین نے مکہ مکرمہ میں وہ کون سا ظلم تھا جو سرکارِ دوعالم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کے ساتھ روا نہ رکھا ہو، آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر اور کاہن کہا گیا، آپ ﷺ کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئی، آپ ﷺ پر پتھروں اور سنگریزوں کی بارش کی گئی، آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ ﷺ کا گلا گھونٹا گیا، نماز کی حالت میں آپ ﷺ پر پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی، آپ کے قتل کے منصوبے تیار کیے گئے، تین سال تک شعب ابی طالب میں آپ ﷺ کو محصور رکھا گیا، جس میں ببول کے پتے کھا کر گزارہ کرنے کی نوبت آئی، طائف میں آپ کو سخت اذیت پہنچائی گئی۔ لوگوں نے آپ ﷺ کو گالیاں دیں اور اتنا زدوکوب کیا کہ آپ ﷺ کے نعلین مبارک خون سے لبریز ہوگئے، آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا، آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی سکون واطمینان سے رہنے نہیں دیا گیا، اور طرح طرح کی یورشیں جاری رکھی گئیں، یہود کے ساتھ مل کر رحمتِ عالم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند مہم چھیڑ دی گئی، فتح مکہ کے موقع پر کفار مکہ کو موت

اپنے سامنے نظر آ رہی تھی، ان کو خطرہ تھا کہ آج ان کی ایذا رسانیوں کا انتقام لیا جائے گا، سرکارِ دوعالم ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: اے قریشیو! تم کو کیا توقع ہے، اس وقت میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ انہوں نے جواب دیا: ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا:

''میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی الزام نہیں؛ جاؤ تم سب آزاد ہو''۔ (زاد المعاد، ج:۱، ص:۴۲۴)

کیا انسانی تاریخ اس رحم و کرم کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

یہودیوں کے ساتھ رواداری

(۸) حضرت سعیدؓ بن المسیب فرماتے ہیں کہ یقیناً اللہ کے رسول ﷺ ایک یہودی خانوادے پر صدقہ کیا کرتے تھے، جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی جاری رکھا گیا۔ (الاموال ابوعبید: ص: ۷۲۸)

(۹) زید بن سعنہ (یہودی، قبول اسلام سے قبل) آپ کے پاس آیا اور قرض کا مطالبہ کیا، جو آپ ﷺ نے اس سے لیا تھا، پھر اس کے بعد اس نے کپڑا پکڑ کر آپ ﷺ کے شانۂ مبارک سے زور سے کھینچا اور اپنی مٹھی میں کپڑے کو لے لیا اور سخت الفاظ میں بات کی، پھر کہا کہ تم عبدالمطلب کی اولاد! بڑے ٹال مٹول کرنے والے ہو، حضرت عمرؓ نے اس کو جھڑکا اور سخت لہجے میں بات کی، لیکن رسول اللہ ﷺ کا رویّہ مسکراہٹ کا رہا، آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: عمر! ہم اور یہ شخص تمہاری طرف سے دوسرے رویّے کے مستحق تھے، مجھے تم قرض جلد ادا کرنے کا مشورہ دیتے اور اس کو نرم طریقے سے تقاضہ کرنے کو کہتے! پھر آپ ﷺ نے فرمایا، کہ اس کی مدتِ ادائیگی میں ابھی تین دن باقی ہیں، بہر حال آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو اس کے قرض کی ادائیگی کا حکم دیا اور بیس صاع

اس کومزید دینے کوفرمایا، کہ یہ اس کا معاوضہ ہے جو حضرت عمرؓ نے اس کوخوف زدہ کردیا تھا،اور پھر یہی بات اس کے اسلام کا باعث بن گئی۔(نبی رحمت،ص:۶۰۳)

یہودیوں کے مختلف قبائل مدینے میں آباد تھے، نبی اکرم ﷺ کے مدینے ہجرت فرما جانے کے بعد، ابتداءً یہود غیر جانب دار اور خاموش رہے؛ لیکن اس کے بعد وہ اسلام اور نبی رحمت ﷺ اور مسلمانوں کے تئیں اپنی عداوت اور معاندانہ رویہ زیادہ دنوں تک نہ چھپا سکے، انہوں نے سرکارِ دوعالم ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ہرممکن کوشش کی، خفیہ سازشیں کیں، بغاوت کے منصوبے بنائے، آپ ﷺ کے کھانے میں زہر ملایا، آپ ﷺ کوشہید کرنے کی تدبیریں سوچیں، اسلام اور مسلمانوں کوزَک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس کی ایک وجہ یہودیوں میں حسد، تنگ دلی، اور جمود وتعصب کا پایا جانا تھا، دوسرے ان کے عقائد باطلہ، اخلاق رذیلہ اور گندی سرشت تھی، لیکن قربان جایئے رحمتِ عالم ﷺ پر کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نہایت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سرکارِ دوعالم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ ایک اہم معاہدہ کیا؛ تاکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم ہوں، اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں اور مشکلات میں ایک دوسرے کی مدد کریں، معاہدے کی تفصیلات پہلے گذر چکی ہیں۔

عیسائیوں کے ساتھ رواداری

عیسائیوں کے ساتھ بھی سرورِعالم ﷺ نے مثالی رواداری برتی۔ مکہ مکرمہ اور یمن کے درمیان واقع ''نجران'' کا ایک موقر وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا، انہوں نے سرکارِدوعالم ﷺ کے ساتھ مذہبی معاملات میں گفتگو کی، عیسائیوں کے ساتھ اس موقع پر ایک تاریخی معاہدہ ہوا، جس میں عیسائیوں

کومختلف حقوق دینے پر اتفاق کیا گیا ہے۔ معاہدے کی دفعات درج ذیل ہے:

(۱) ان کی جان محفوظ رہے گی۔

(۲) ان کی زمین جائداد اور مال وغیرہ ان کے قبضے میں رہے گا۔

(۳) ان کے کسی مذہبی نظام میں تبدیلی نہ کی جائے گی۔ مذہبی عہدے دار اپنے اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے۔

(۴) صلیبوں اور عورتوں کونقصان نہ پہنچایا جائے گا۔

(۵) ان کی کسی چیز پر قبضہ نہ کیا جائے گا۔

(۶) ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی۔

(۷) اور نہ پیداوار کا عشر لیا جائے گا۔

(۸) ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے گی۔

(۹) ان کے معاملات اور مقدمات میں پورا انصاف کیا جائے گا۔

(۱۰) ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہونے پائے گا۔

(۱۱) سودخوری کی اجازت نہ ہوگی۔

(۱۲) کوئی ناکردہ گناہ کسی مجرم کے بدلے میں نہ پکڑا جائے گا۔

(۱۳) اور نہ کوئی ظالمانہ زحمت دی جائے گی۔ (دین رحمت:۲۳۹، بحوالہ: فتوح البلدان بلاذری)

مذکورہ بالا جوحقوق اسلام نے دیگر اقوام اور رعایا کو عطا کیے ہیں، ان سے زیادہ حقوق توکوئی اپنی حکومت بھی نہیں دے سکتی۔

جو غیرمسلم اسلامی حکومت میں رہتے ہیں، اس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے، کہ وہ اللہ ورسول کی پناہ میں ہیں؛ اسی لیے ان کو ذمی کہا جاتا ہے، اسلامی قانون یہ ہے کہ جو غیرمسلم (ذمی) مسلمانوں کی ذمہ داری میں ہیں، ان پر کوئی ظلم ہوتو اس کی مدافعت مسلمانوں پر ایسی ہی لازم ہے، جیسی خود مسلمانوں پر ظلم ہوتو اس کا دفع کرنا ضروری ہے۔ (المبسوط للسرخسی:۸۵۱)

خلفاء راشدین کی رواداری

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رواداری

اسلام کے سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق ایک سریہ (لشکر) حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں شام کی طرف روانہ فرمایا، تو ان کو حسبِ ذیل ہدایات دیں:

''خیانت نہ کرو، عہد شکنی نہ کرو، مالِ غنیمت کو نہ چھپاؤ، کسی مقتول کی صورت نہ بگاڑو، کسی بچے یا بڑے بوڑھے یا عورت کو قتل نہ کرو، کھجور کے درخت کو قطع نہ کرو، نہ جلاؤ اور نہ کسی دوسرے پھل دار درخت کو کاٹو، اور کوئی بکری یا گائے یا اونٹ بہ جز کھانے کی ضرورت کے ذبح نہ کرو''۔ (جواہر الفقہ، ج:۲/ص:۲۷۹)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رواداری

اور خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے معاہدات، جو اہلِ ذمہ کو لکھ کر دیے گئے، کتب روایت و تاریخ میں مشہور و معروف ہیں، اور اسلامی حکومتوں میں ہمیشہ انہی پر عمل ہوتا رہا ہے، ان میں سے ایک عہد نامے کی نقل پیش کی جاتی ہے، جو قدس (ایلیا) کے اہل ذمہ کو لکھ کر دیا گیا ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ وہ امان نامہ ہے جو اللہ کے بندے عمر امیر المومنین نے ایلیا کے باشندوں کو دیا ہے، انہیں، ان کی جانوں، ان کے مال، ان کی کلیساؤں، ان کی صلیبوں کو تحفظ دیا ہے چاہے وہ بری حالت میں

ہوں یا اچھی حالت میں اور ان کے تمام اہل مذاہب کو بھی یہی تحفظ دیا ہے کہ ان کی کلیساؤں میں کوئی نہیں رہے گا، نہ ان کو گرایا جائے گا، نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ اس کے سامان میں کمی کی جائے گی اور نہ ان کی صلیبوں یا ان کی مال میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے دین میں ان پر کوئی زبردستی ہوگی اور نہ ان میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے گی۔ (تاریخ طبری، ج:۳/۶۰۹)

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بہ نفس نفیس غیر مسلموں کے حالات کی نگرانی رکھتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ بصرہ سے ایک وفد آیا، تو ان سے پوچھا کہ وہاں مسلمان غیر مسلم شہریوں کو کوئی تکلیف تو نہیں دیتے؟ وفد کے لوگوں نے کہا کہ نہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ غیر مسلموں کو ان کے حقوق دیتے ہیں۔ (تاریخ طبری، ج:۴/ص:۲۱۸)

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر ایک بوڑھے یہودی کے پاس سے ہوا، جو بھیک مانگ رہا تھا، آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور اسے اپنے گھر سے کچھ دیا، پھر بیت المال کے نگراں سے کہا، کہ اس شخص جیسے لوگوں کو دیکھو، اللہ کی قسم اگر ہم اس کی جوانی کو کھا جائیں اور بڑھاپے میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیں تو یہ ہمارا انصاف نہیں، چناں چہ آپ نے اس جیسے بوڑھوں سے جزیہ لینا بند کر دیا اور بیت المال سے ان کا وظیفہ دینے کا حکم دیا۔ (کتاب الخراج:۲۵۹-۲۶۰)

شہادت سے کچھ پہلے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو جو وصیتیں فرمائیں ان میں یہ وصیت بھی شامل تھی کہ:

''اور میں اپنے بعد آنے والے کو ان (غیر مسلموں) کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، جن کی ذمہ داری اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کیا جائے اور ان کی حفاظت کے لیے (اگر جنگ کرنی پڑی تو) جنگ کی جائے اور ان کو کسی ایسی بات کا مکلف نہ کیا جائے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو''۔ (اسلام اور سیاسی نظریات، ص:۳۰۷)

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی رواداری

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ امیر المومنین تھے، اس وقت قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے خلاف فیصلہ دیا، حضرت علیؓ کی ایک زرہ گم ہوگئی تھی، آپ نے ایک یہودی کے پاس دیکھی جو اسے بیچنے کی کوشش کررہا تھا، لیکن یہودی نے کہا کہ یہ تو میری زرہ ہے اور میرے قبضے میں ہے، چنانچہ معاملہ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں پہنچا، قاضی شریحؒ نے حضرت علیؓ سے گواہ مانگے، حضرت علیؓ نے ایک گواہ قنبر کو پیش کیا اور دوسرے گواہ کے طور پر اپنے بیٹے کو پیش کیا، حضرت قاضی شریحؒ نے فرمایا کہ بیٹے کی گواہی اپنے باپ کے حق میں قبول نہیں ہے، چناں چہ یہودی کے حق میں فیصلہ کردیا۔ (اسلام اور سیاسی نظریات، ص:۱۹۳)

ذیل میں ہم اسلام کی ان تعلیمات کو پیش کررہے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے تمام انسانوں کے انسانی، تمدنی اور مالی حقوق کا تحفظ کیا ہے اور مساوات وہم دردی کی تعلیم دی ہے، رواداری اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت میں چولی دامن کا ساتھ ہے، جتنی زیادہ رواداری ہوگی دوسروں کے مختلف حقوق کی اتنی ہی حفاظت کی کوشش کی جائے گی۔

اسلام میں انسانیت کا احترام

اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے، اس کے احترام واکرام کی تعلیم دی ہے، انسان ہونے کے ناطے اس کو پوری کائنات پر فضیلت وبرتری عطا کی ہے، ارشاد ربانی ہے:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا"۔ (بنی اسرائیل/۷۰)

"ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور خشکی اور دریا میں ان کو سوار کیا اور روزی دی ان کو پاکیزہ چیزوں سے، اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی ہے"

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں انسانوں کو سب سے اچھی شکل وصورت عطا فرمائی، ارشاد ربانی ہے:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" (سورہ والتین/۴)

"ہم نے آدمی کو اچھی شکل وصورت میں پیدا کیا ہے"۔

اسلام نے اعلان کیا ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں حق جل شانہ نے انسانوں کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (البقرۃ/۲۹)

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کی ہیں"۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔

"میں نے سب جنات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے"۔

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کا مقام اتنا بلند کیا ہے کہ انسان کو دنیا میں اپنی نیابت کا شرف بخشا اور ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کی عزت وعظمت، مجد وشرافت کا انکار کرنے اور ان کے سامنے سجدۂ تعظیمی ادا کرنے پر ابلیس کو ہمیشہ کے لیے بارگاہِ صمدیت سے ذلیل وخوار کرکے نکال دیا گیا ہے۔

اسلام میں انسانی حرمت وشرافت کی کتنی پاسداری ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں تعلیم دی گئی ہے، کہ انسان کا احترام پسِ مرگ بھی ضروری ہے اور یہ حکم ہے کہ مُردے کو پوری عزت واحترام کے ساتھ غسل دیا جائے

،صاف ستھرا کفن پہنا کر خوشبو سے معطر کیا جائے، نمازِ جنازہ پڑھی جائے، پھر کاندھوں پر اٹھا کر اسے قبرستان لے جایا جائے اور دفن کیا جائے، انسان ہونے کے ناطے ہر شخص کا احترام ضروری ہے۔ ایک بار غیر مسلم کا جنازہ گذر رہا تھا، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یہ تو یہودی عورت کا جنازہ ہے، ارشاد فرمایا کہ موت ایک خوف ناک چیز ہے، پس تم جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جایا کرو۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

’’اَلَیْسَت نفساً‘‘ ’’انسان تو یہ بھی ہے۔ (مشکوٰۃ شریف، ص:۱۴۴، ۱۴۷)

زمانۂ جاہلیت میں جنگ کے دوران دشمنوں کے ساتھ ہر برا سلوک روا رکھا جاتا تھا، ان کے جسمانی اعضا کاٹ دیے جاتے تھے، دشمنوں کی کھوپڑیوں میں شراب پی جاتی تھی، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا حضرت حمزہؓ کے بدن کے بعض اعضا بھی غزوۂ احد کے موقع پر دشمنانِ اسلام نے کاٹ لیے تھے، اسلام نے انسانی حرمت کو پامال کرنے والے ان کاموں سے سختی کے ساتھ روک دیا اور مُردوں کی ہر طرح کی بے حرمتی ناجائز قرار پائی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مُردہ کی ہڈی کو توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کے مانند ہے۔ (مشکوٰۃ شریف، ص:۱۴۹)

اسلام میں انسانی عظمت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسلامی عقیدے کے مطابق جتنے انبیاء و رسل دنیا میں انسانوں کی ہدایت کے لیے تشریف لائے وہ سب کے سب انسان تھے۔ یہودی حضرت داؤد، حضرت یعقوب اور حضرت عزیر علیہم السلام کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک خدا کا بیٹا تھا، عیسائی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے، قادرِ مطلق اور تین ارکانِ الوہیت میں سے ایک ہیں۔

برادرانِ وطن کا عقیدہ اوتاروں کی نسبت یہ ہے کہ ’’پرمیشور‘‘ نے خود مادّی جسم قبول کر کے مادّی صورت میں جلوہ گری فرمائی تھی، ان عقیدوں سے انسانیت

کی توہین لازم آتی ہے کہ انسان کا درجہ اتنا کمتر اور فروتر ہے کہ مذکورہ عظیم شخصیات انسانوں میں پائی ہی نہیں جاسکتیں، بلکہ یہ مقام بلند، ان ہستیوں کے لیے خاص ہے جو حقیقتاً انسان نہ تھے، اسلام کے عقیدے سے انسانیت کا درجہ بلند تر ہوتا ہے، کیونکہ انسان ہی مذکورہ بالا خوبیوں اور کمالات کا سر چشمہ ثابت ہوتا ہے ؎

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا ❁ مگر اس میں ہوتی محنت زیادہ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنے فضل و کرم سے عقل و خرد کی بیش بہا دولت سے نوازا ہے جس کی بدولت وہ ساری کائنات پر حکمرانی کرتے ہیں، عقل و خرد سب انسانی خوبیوں اور کمالات کا سر چشمہ ہے، ارشادِ نبوی ہے:

مَاخلَقَ اللّٰهُ خَلْقاً اَکْرَمَ عَلَیْهِ مِنَ الْعَقْلِ

اللہ کی تمام پیدا کردہ چیزوں میں عقل اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت ہے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر، اسلام نے عقل کی حفاظت پر خصوصی توجہ دی ہے کہ، عقائد اور اخلاق و اعمال میں اعتدال عقل سلیم سے ہی قائم رہتا ہے اور انسان کے لیے حقوق و فرائض کی انجام دہی آسان ہوتی ہے، نیز قرآن کریم میں جگہ جگہ عقل کے استعمال اور غور و خوض و تدبر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے؛ تاکہ انسان دلائل النفس و آفاق میں غور و فکر کر کے نظام الٰہی اور پیامِ ربّانی کی حقانیت کا اعتراف کرے اور اس کے مطابق زندگی استوار رکھنے کا عہد کرے۔

انسانی اخوت و مساوات

انسانی اخوت کا تصور سب سے پہلے اسلام نے ہی پیش کیا ہے اور ہر طرح کے تفریق و امتیاز اور اونچ نیچ کو مٹانے کا اعلان کیا ہے، اسلام کی تعلیم ہے کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، بہ حیثیت انسان ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں، ارشاد ربانی ہے:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔ (النساء/۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا کیں۔

اسلام کی نظر میں ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا:

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ۔ (مشکوۃ شریف: باب الشفقۃ: ص:۴۲۵)

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اللہ کے نزدیک سب مخلوق میں پسندیدہ وہ شخص ہے، جو اللہ کے کنبے کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرتا ہو۔

قرآن کریم نے انسانی وحدت ومساوات کے تصور کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے ہی جگہ جگہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اور یٰبَنِی آدَمَ جیسے الفاظ کے ذریعے تمام افراد انسانی کو اپنے لازوال پیغام کا مخاطب بنایا ہے اور سب کو یکساں طور پر دنیا وآخرت میں صلاح وفلاح کی دعوت دی ہے، جن افراد نے اس کی دعوت پر لبیک کہا، ان کو یاایّھا الذین آمنوا سے خطاب کیا گیا، انسانوں میں نسلی یا طبقاتی امتیاز اور فرق کو روا نہیں رکھا گیا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر سرکارِ دوعالم ﷺ نے اپنے تاریخی خطبے میں جن بنیادی انسانی حقوق سے متعلق وصیت وہدایت فرمائی، ان میں انسانی وحدت ومساوات کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ، وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ، وَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ اِلَّا بِالتَّقْوٰى۔ (العقد الفرید:۲/۱۱۱)

”اے لوگو! یقیناً تمہارا پروردگار ایک ہے، تمہارے باپ بھی ایک ہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، یقیناً تم میں اللہ تعالیٰ کے

نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی اور پاک باز ہو، کسی عربی کو عجمی پر کوئی برتری نہیں، مگر تقویٰ کی بنا پر“

فتح مکہ کے موقع پر اہم ترین خطبے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَافَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِأَعْجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى وَلَا فَضْلَ لِلْاَنْسَابِ۔ (سنن ابی داؤد)

”کسی عربی کو کسی غیر عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی غیر عربی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر، مگر پرہیزگاری کی بنیاد پر، اور حسب ونسب کی بنیاد پر کوئی فضیلت نہیں“۔

تمام انسان اسلامی تعلیمات کی رو سے بھائی بھائی ہیں، حسب ونسب اور خاندان وقبائل صرف تعارف اور شناسائی کا ذریعہ ہیں: وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اور ہم نے تم کو مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں پیدا کیا ہے؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّى أَشْهَدُ أَنَّ النَّاسَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ)

”اے اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ سب سے انسان بھائی بھائی ہیں“۔

محسنِ انسانیت ﷺ نے صرف اس کا اعلان ہی نہ فرمایا، بلکہ اس اصول کو انسانی زندگی کا دستور العمل بنا دیا، ساری زندگی اس پر عمل کر کے دکھایا اور اپنے پیروکاروں کے سامنے اس کا ایسا واضح نمونہ قائم فرمایا کہ وہ بھی اس دستور اور اصول کو فراموش نہ کر سکے اور انسانی اخوت ووحدت اور مساوات کا تصور ان کے اعمال واخلاق میں ہمیشہ جلوہ گر نظر آیا۔

اسلام کے احکام واعمال میں بھی مساواتِ انسانی کا مکمل لحاظ کیا گیا ہے، نماز میں سب لوگ اللہ کے حضور ایک ہی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہیں، کسی بادشاہ،

امیر یا عالم کے لیے کوئی خاص جگہ مخصوص نہیں ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز
بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے
تیرے دربار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

رمضان کے روزوں میں بھی سب مسلمان یکساں طور پر بھوکے رہتے ہیں، روزے داروں میں بھی امیر وغریب کا کوئی فرق نہیں ہوتا، حج میں سب ایک ہی طرح کا احرام باندھتے ہیں اور حج کے اعمال یکسانیت واجتماعیت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

عام انسانوں پر رحم وکرم:

اسلام دین رحمت ہے، بلاتفریق قوم ومذہب تمام انسانوں پر رحم وکرم اس کی خصوصیات میں داخل ہے، اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب یا تہذیب میں انسانیت نوازی اور عام انسانوں پر رحم وکرم کا وہ تصور نہیں ملتا، جو اسلام نے پیش کیا ہے، محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِيْ الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِيْ السَّمَاءِ۔ (بخاری شریف باب ماجاء فی رحمۃ الناس)

"رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا"۔

مولانا حالیؒ نے اس حدیث شریف کو شعر کا جامہ پہنا دیا ہے فرماتے ہیں:

کرو مہربانی تم اہلِ زمین پر ❁ خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، ان کی خدمت، ان کی حاجت روائی، دکھ درد میں ان کی دست گیری اور امداد سے اللہ تعالیٰ بے حد خوش ہوتے ہیں۔ اسلام میں تو انسانوں کی خدمت کو اللہ تعالیٰ کی خدمت سے تعبیر کیا گیا ہے، اس میں مذہب وملت

کی کوئی تخصیص نہیں، مسلم وغیر مسلم سب برابر ہیں، حدیث قدسی ہے:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، وہ حیرت سے جواب دے گا، پروردگارِ عالم! میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ تو تو ساری دنیا کا خود پالن ہار ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تجھے یہ علم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے، تو تو نے اس کی عیادت اور مزاج پُرسی نہیں کی، کیا تجھے اس کی خبر نہ تھی، کہ اگر تو اس کی عیادت کو جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا؛ لیکن تو نے مجھے کھانا نہ دیا، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار! میں آپ کو کھانا کیسے کھلاتا، آپ تو سارے جہاں کے پالنہار ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا، تو نے اسے کھانا نہ دیا، تجھے علم نہ تھا کہ اگر تو میرے اس بندے کو کھانا کھلاتا تو مجھے بھی وہاں پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی طلب کیا، تو نے مجھے پانی نہ پلایا، بندہ کہے گا کہ میں آپ کو پانی کس طرح پلا سکتا تھا؟ جب کہ آپ رب العالمین ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا، تو نے اسے پانی نہ پلایا، اگر تو نے اس کو پانی پلایا ہوتا تو اس کا بدلہ میرے پاس ضرور پاتا"۔ (مشکوۃ شریف:۱۲۳)

انسانوں پر رحم وکرم کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا رَحِيْمٌ۔ "جنت میں رحم دل انسان ہی داخل ہوگا"۔ صحابہؓ نے عرض کیا: "یا رسول الله! کلّنا رحیم"۔ یارسول اللہ! ہم سب رحم دل ہیں، سرکار نے ارشاد فرمایا "لَا، حتیّٰ يَرْحَمَ الْعَامَّة "نہیں! رحم دل وہ ہے جو عام مخلوق پر رحم کرے۔ (کنزالعمال، ابواب الاخلاق:۳۱)

تمام انسانوں کو بھائی بھائی بن کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے، اور ایسی ہر بات سے روکا گیا ہے جس سے آپسی تعلقات خراب ہوں، اور رشتۂ اخوت کمزور پڑنے کا خطرہ پیدا ہو، ارشادِ نبوی ہے:

لَاتَقَاطَعُوا،وَلَا تَدَابَرُوا،وَلَا تَبَاغَضُوا،وَلَا تَحَاسَدُوا وَكُونُوا عِبَادَاللّٰهِ اِخْوَانًا۔ (سنن ترمذی، باب ماجاء فی الحسد)

ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، آپس میں بغض وعداوت نہ رکھو، باہمی حسد نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

انسانی جان کی حفاظت

اسلام سے پہلے انسانی جان کا کوئی احترام نہ تھا، قتل وخوں ریزی عام تھی، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا، امن وامان ناپید تھا، انسانی رشتوں کا پاس ولحاظ نہیں رہا تھا، اسلام نے تشدد پسندی اور دہشت گردی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور انسانی جانوں کی عظمت وحفاظت کا حکم دیا، امیر ہو یا غریب، سلطان ہو یا گدا، مرد ہو یا عورت، متمدن ہو یا غیر متمدن، تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ، بڑے خاندان کا ہو یا چھوٹے خاندان کا، مسلمان ہو یا غیر مسلم تمام لوگوں کی جانوں کی حفاظت کو ضروری قرار دیا گیا اور اس سلسلے میں کسی امتیاز اور تفریق کو روا نہیں رکھا گیا۔ اسلام نے انسانی جان کو حرمت وعظمت عطا کی اور اس کی بے حرمتی کی سختی سے ممانعت کی، قتل وخوں ریزی کا ترغیب وترہیب کے ذریعے سدّ باب کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَاتَقْتُلُوا لنَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِ۔ (بنی اسرائیل:۳۳)

جس شخص کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہ کرو، مگر حق شرعی کے ساتھ۔

اسلام نے ایک انسان کے ناحق قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مساوی قرار دیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْفَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَافَكَاَنَّمَا أَحْيَى النَّاسَ جَمِيعًا . (سورہ مائدہ آیت:۳۲)

جو شخص کسی ایسی جان کو قتل کرے، جس نے کسی کو قتل نہ کیا ہو اور نہ اس نے

روئے زمین پر فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا، اور جو کسی انسانی زندگی کے بقا کا سبب بنا تو اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

کیونکہ اصل چیز انسانیت کی حرمت ہے، جب انسانی زندگی کا احترام ہی دل سے اٹھ جائے گا تو ایک شخص کا قتل کیا، پوری جماعت کے قتل میں کوئی دریغ محسوس نہیں ہوگا، ظلم وتعدی کرنے والوں کے لیے دونوں برابر ہوں گے۔

انسانی جانوں کے احترام اور ان کی بے حرمتی سے اجتناب کا حکم سب انسانوں سے متعلق ہے، مسلم، غیر مسلم، اپنے اور پرائے کا فرق نہیں رکھا گیا ہے، انسانی جان کی حفاظت کا معاملہ اتنا اہم تھا کہ نبی رحمت ﷺ جب اسلام کے لیے بیعت لیا کرتے تھے تو جہاں دوسری ضروری باتوں کے سلسلے میں اقرار لیتے تھے، وہیں اس بات کا بھی عہد کراتے تھے کہ بیعت کرنے والے کسی بھی شخص کو ناحق قتل نہیں کریں گے۔ (سنن بیہقی:۳۰/۸)

اسلام نے ذمیوں اور دیگر اقوام کے ساتھ جس رواداری کا معاملہ کیا ہے اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

انسانی عزت وناموس کا تحفظ

انسان کی عزت وآبرو کی حفاظت کو اسلام نے بڑی اہمیت دی ہے اور اسے انسان کے بنیادی حقوق میں شامل کیا ہے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے عزت نفس اور خودداری عطا کی ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، یا کسی بھی رنگ ونسل، ملک وطن اور ذات برادری سے تعلق رکھتا ہو، عزت نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو انسان سخت اذیت محسوس کرتا ہے، انسانی عزت وناموس کی حفاظت کی خاطر ہی اسلام نے انسانی مساوات کی تعلیم دی ہے، انسانوں میں ان کی خصوصیات یا کمالات اور تدین وتقویٰ کے اعتبار سے تو فرق مراتب ہوسکتا ہے؛ لیکن بہ حیثیت انسان تمام افراد بشر میں وحدت

وہ مساوات ہے، اسلام سے پہلے مختلف تہذیبوں میں نہ انسانوں میں مساوات تھی، نہ ہی ان کی عزت وآبرو محفوظ تھی، ہندوستانی معاشرہ بھی درج ذیل طبقوں میں بٹا ہوا تھا:

(۱) برہمن اور اعلیٰ مذہبی (۲) فوجی اور سپاہی یعنی چھتری (۳) تجارت اور زراعت کرنے والے یعنی ''ویش'' (۴) خدمت گار یعنی شودر۔ منوسمرتی قوانین میں برہمن کو مرکزی مقام حاصل تھا، وہ بہر حال نجات یافتہ سمجھا جاتا، چاہے گناہوں کے دلدل میں پھنسا ہوا ہو۔ ''شودر'' سب سے زیادہ قابل رحم تھے، ان کا کام صرف ''برہمنوں'' ''چھتریوں'' اور ''ویشوں'' کی خدمت کرنا ہوتا، حکم تھا کہ دس برس کا برہمن اور سو برس کا چھتری دونوں آپس میں باپ بیٹے کی طرح رہیں، برہمن لڑکا باپ اور چھتری بیٹے کی طرح، اگر چھتری دونوں ویش اور شودر میں کوئی غصہ کرکے ایک تنکے سے بھی برہمن کو مارتے تو اکیس جنم تک پاپی یعنی کتا، گدھا وغیرہ کے جسم میں پیدا ہو۔ (مقدمہ تاریخ ہند: ۲/۱۰۸)

ایران کے سلاطین اس بات کے مدعی تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے، اہل ایران بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتے تھے، کہ گویا وہ خدا ہیں، اونچ نیچ کا فرق، طبقوں کا تفاوت اور پیشوں کی تقسیم، ایرانی سوسائٹی اور نظام زندگی کا اٹل قانون تھا جس میں ردو بدل ممکن نہ تھا (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج زوال کا اثر، ص:۵۰) ایسارٹی نوجوان، ہیلاٹ قوم کے لوگوں کا شکار کھیلتے تھے اور ان کے تڑپنے کا تماشہ دیکھتے تھے۔ (مقدمہ تاریخ ہند: ۲/۱۰۸)

یہودی اپنے آپ کو خدا کی اولاد قرار دیتے تھے، اور دوسرے افراد کو شیطان کی اولاد سے تعبیر کرتے تھے۔ اسپین میں ''کسی طرح کے سیاسی حقوق یا ایسے حقوق جو ایک آزاد شخص کو کسی حکومت میں حاصل ہوتے ہیں ان سے اسپین کی رعایا محروم تھی'' (اسلام میں رواداری بہ حوالہ تاریخ اسپین، ص: ۲۵)

یونان ومصر، روم اور عرب خطوں اور دیگر ممالک کا حال اس سے مختلف نہ تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج زوال کا اثر''۔

ان حالات میں اسلام نے جو تعلیمات پیش کی ہیں ان میں انسانوں کو وہ تمام حقوق دیے گئے ہیں، جو انسان کے بنیادی حقوق ہیں، جن میں انسانی مساوات اور انسان کی عزت وناموس کی حفاظت کا حق بھی ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں جو تاریخی خطبہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اس میں انسانی عزت وآبرو کی حفاظت وحرمت کی بھی تاکید کی گئی، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

> ''تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزتیں اسی طرح قیامت تک حرام ہیں، جس طرح یہ دن یہ مہینہ (ذی الحجہ) اور یہ شہر (مکہ مکرمہ) سنو! مجھ سے وہ باتیں سنو جس سے تم صحیح زندگی گزار سکو گے، خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا''۔ (نبی رحمت بہ حوالہ مسند احمد، ص:۵۳۵)

اسلام نے ان تمام باتوں سے شدت سے منع کیا ہے، جن سے کسی انسان کی عزت نفس متاثر ہو اور اس کی تذلیل یا تحقیر ہو۔ چناں چہ کسی پر الزام تراشی، غیبت وبدگوئی، چغل خوری، دوڑخاپن، استہزاء وتضحیک، عیب جوئی، بدگمانی، تکبر اور غرور، بغض وحسد اور کینہ کپٹ سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَاِثْمًا مُبِينًا۔ (نساء:۱۶)

> ''جو کوئی خطا یا گناہ کرے، پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے اس نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لادا''۔

مذہبی آزادی کا تحفظ

اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ بڑی شدومد سے کیا جارہا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہے اور اسلام نے انسانوں کی مذہبی آزادی کا لحاظ نہیں کیا ہے؛

بلکہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے بنی نوعِ انسانی کی مذہبی آزادی کا جتنا تحفظ کیا ہے اس کی مثال کسی اور مذہب یا تہذیب میں نہیں ملتی۔ اسلام سے پہلے مذہب قبول کرنے کے سلسلے میں بے رحمی اور تشدد اتنا زیادہ تھا، کہ جو لوگ انکار کرتے وہ بھڑکتی آگ میں جھونک دیے جاتے تھے۔ پھاڑ کھانے والے درندوں کے سامنے ڈال دیے جاتے تھے، تانبہ پگھلا کر ان پر ڈالتے تھے یا ان کو مدہم آگ پر کئی کئی روز تک لٹکائے رہتے تھے، ان کے شور وفغاں کی بالکل پروا نہیں کی جاتی تھی۔ (المدنیۃ والاسلام:۱۴۳)

اسلام ساری انسانیت کے لیے پیامِ رحمت بن کر آیا، اس نے دین ومذہب کے سلسلے میں بھی بڑی وسعت ظرفی اور حوصلے کا مظاہرہ کیا اور اعلان کیا کہ: ہر شخص کو مذہب کے سلسلے میں مکمل آزادی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

لَااِکْرَاہَ فِیْ الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (بقرہ:۳۴)

''دین کے سلسلے میں کسی طرح کی کوئی زور وزبردستی نہیں ہے، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے''۔

ایک انصاری صحابی کے دو لڑکے عیسائی تھے، انہوں نے سرکارِ دوعالم ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے دونوں لڑکوں کو اسلام لانے کے لیے مجبور کرنا چاہتا ہوں، اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ دین میں کوئی زور وزبردستی نہیں، تو صحابی اپنے ارادے سے باز آگئے۔

قرآن کریم میں نبی رحمت ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں، زور وزبردستی کرنے والے (داروغہ) نہیں۔ (غاشیہ:۲۱-۲۲)

اسلامی قانون میں مذہبی آزادی اور رواداری کی حسبِ ذیل اہم بنیادیں ہیں۔ جو قرآن کریم کے نصوص سے ماخوذ ہیں:

(۱) تمام سماوی مذاہب وادیان کا سرچشمہ ایک ہے، ارشاد ربانی ہے: اللہ

نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے، جس کا حکم نوح علیہ السلام کو دیا گیا اور جس کا حکم آپ کو بھی دیا گیا اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو بھی دیا کہ قائم کرو دین کو اور اس میں اختلاف نہ کرو۔ (الشوریٰ:۱۳)

(۲) تمام انبیاء کرامؑ کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں تفریق درست نہیں۔ (البقرہ:۱۳۶)

(۳) دین میں جبر واکراہ اور زور زبردستی نہیں۔ دین ومذہب کے اختیار کرنے کا معاملہ ہر انسان کی رضا ورغبت پر موقوف ہے۔ (البقرہ:۲۵۶ ویونس:۹۹)

(۴) تمام ادیان کی عبادت گاہیں اور مذہبی مقامات قابل احترام ہیں، ان کی حمایت اور دفاع ضروری ہے۔ (الحج:۴۰)

(۵) دیگر مذاہب کے معبودوں کو برا نہ کہا جائے۔ (انعام:۱۳)

(۶) مذہبی اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کو قتل کرنے یا ایک دوسرے پر تعدی کرنے سے منع کیا گیا ہے اور نیکی کے کاموں کو فروغ دینے اور برائی کو مٹانے میں باہمی تعاون پر زور دیا گیا ہے۔ (مائدہ:۲)

(۷) دنیاوی زندگی میں لوگوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دیے جانے کا معیار اور خود اللہ کے نزدیک معیارِ فضیلت، پاکبازی، تقویٰ شعاری، نیکی وبھلائی کے کاموں میں سبقت ہے۔ (الحجرات:۱۳)

(۸) دنیوی مذہبی اختلاف، نیکی، صلہ رحمی اور ضیافت ودل داری میں حائل نہ ہونا چاہیے۔ (مائدہ:۵)

(۹) ایک دوسرے کے مذاہب سے متعلق مذاکرات اور بحث ومباحثہ اچھے اسلوب میں احترام کی حدود میں رہ کر کیا جانا چاہیے۔ (العنکبوت:۴۶)

(۱۰) دیگر مذاہب والوں کے بارے میں بھی عدل اور اعتدال پر قائم رہنا ضروری ہے۔ (مائدہ:۱)

غیر مسلم رعایا کے ساتھ رواداری

اسلام تمام افراد بشر اور طبقات انسانی کے لیے رحمت ورافت کا پیکر بن کر آیا ہے؛ اس لیے اس نے غیر مسلم اقوام اور رعایا کے ساتھ مثالی رحم وکرم، مساوات وہمدردی اور رواداری کا معاملہ کیا اور ان کو انسانی تاریخ میں پہلی بار وہ سماجی اور قومی حقوق عطا کیے، جو کسی مذہب یا تمدن والوں نے دوسرے مذہب وتمدن والوں کو کبھی نہیں دیے۔ جو غیر مسلم اسلامی ریاست میں قیام پذیر ہوں اسلام نے ان کی جان، مال، عزت وآبرو اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ اور حکمرانوں کو پابند کیا ہے کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے مساوی سلوک کیا جائے۔ ان غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی پناہ میں ہیں، اس بنا پر اسلامی قانون ہے کہ جو غیر مسلم، مسلمان کی ذمہ داری میں ہیں، ان پر کوئی ظلم ہو تو اس کی مدافعت مسلمانوں پر ایسی ہی لازم ہے، جیسی خود مسلمانوں پر ظلم ہو تو اس کا دفع کرنا ضروری ہے۔ (مبسوط سرخسیؒ: ۱/۸۵)

اگر کوئی مسلمان ذمی پر ظلم کرتا ہے تو یہ مسلمان پر ظلم کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ (درمختار مع ردالمختار: ۵/۳۹٦)

جو حقوق مسلمانوں کو حاصل ہیں، وہی حقوق ذمیوں کو بھی حاصل ہوں گے، نیز جو واجبات مسلمانوں پر ہیں وہی واجبات ذمیوں پر بھی ہیں۔ ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کی طرح محفوظ ہے اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح محفوظ ہے۔ (درمختار کتاب الجہاد)

اسلام نے طے کیا ہے کہ جو شخص اس غیر مسلم کو قتل کرے گا، جس سے معاہدہ ہو چکا ہے وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا، جب کہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔ (حدیث شریف: ابن کثیر: ۲/۲۸۹)

ذمیوں کے اموال اور املاک کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

سرکارِ دوعالم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

”سنو! جو کسی معاہد (غیر مسلم) پر ظلم کرے گا، یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا طاقت سے زیادہ اس کو مکلّف کرے گا یا اس کی کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس (غیر مسلم) کی طرف سے دعوے دار بنوں گا۔ (مشکاۃ شریف ص،: ۳۵۴)

غیر مسلم رعایا کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ ان کے تعلیمی ادارے آزاد ہوتے اور ان کے شخصی قوانین کے لیے عدالتیں بھی آزاد رہتیں، ان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوتی تھے، مذہب کے سلسلہ میں کسی طرح کا جبر روا نہیں رکھا جاتا تھا۔

کسی بھی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسلامی تاریخ میں کبھی کسی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں پر کبھی زبردستی کی گئی ہے، یہاں تک کہ ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ایک حاکم نے کچھ لوگوں کو دھمکیاں دے کر زبردستی مسلمان بنا لیا تھا، اس وقت کے مفتی حضرات نے فتویٰ دیا کہ چوں کہ ان پر زبردستی کی گئی ہے؛ اس لیے انہیں اپنے پچھلے دین پر واپس جانے کا حق حاصل ہے اور قاضی کے سامنے زبردستی کا ثبوت پیش ہوا تو قاضی نے فیصلہ دیا کہ انہیں اپنے سابق دین کی طرف واپس جانے اور اس پر عمل کرنے کا موقع دیا جائے، چناں چہ ان میں سے اکثر لوگ اپنے دین کی طرف واپس چلے گئے۔ (اسلام اور سیاسی نظریات، ص: ۳۰٦)

غیر مسلموں کی قسمیں اور ان کے احکام

حضرات فقہائے کرامؒ نے احکام کے اعتبار سے غیر مسلموں کی چار قسمیں کی ہیں:

(۱) اہل ذمہ

وہ غیر مسلم جو کسی اسلامی مملکت سے وفاداری کا عہد کر کے اس مملکت میں سکونت اختیار کریں، ان کو فقہاء کی اصطلاح میں ذمی کہا جاتا ہے، جس کے معنی یہ

ہیں، کہ مسلمانوں کا معاملہ ان سے صرف مصالحانہ ہی نہیں، کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہونچائیں، بلکہ محافظانہ ہے کہ ان کی مکمل حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہے، پھر ان کی دو قسمیں ہیں (الف) وہ غیر مسلم جنھوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ پھر فوجی طاقت کے ذریعے ان کا ملک فتح کیا گیا اور وہ عنوۃً (قہرا) مغلوب ہو کر مملکت اسلامی کے وفادار شہری بننے پر راضی ہو گئے (ب) وہ غیر مسلم جو اول ہی سے صلح ومعاہدے کے ساتھ اسلامی مملکت کا جز بن گئے۔ جیسے عہد رسالت میں اہل نجران نے اور عہد فاروقی میں بنی تغلب نے خاص معاہدے کے ساتھ اسلامی مملکت کی اطاعت قبول کی۔ یہ دونوں فریق عام شہری حقوق میں بالکل مسلمانوں کے مساوی ہوتے ہیں اور ان سے فوجی خدمات نہیں لی جاتیں؛ بلکہ ان پر ایک نہایت معمولی ٹیکس ڈالا جاتا ہے یہ ٹیکس فریق دوم سے اس معاہدے کے موافق لیا جاتا ہے، جو بوقتِ مصالحت آپس میں طے ہو جائے اس میں کمی بیشی کا کسی امیر یا صدرِ مملکت کو اختیار نہیں ہوتا۔

فریق اول سے یہ ٹیکس اسلام کے مقرر کردہ قانون کے مطابق لیا جاتا ہے اور اس میں بھی ان کی مالی حیثیت کی رعایت اور ادائیگی کی سہولت کی رعایت کی جاتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دار غنی سے صرف اڑتالیس درہم سالانہ اور متوسط الحال آدمی سے اس کا نصف اور ادنیٰ درجہ کے آدمی سے بشرطے کہ وہ اپنی روزی پیدا کرنے اور کمانے والا ہو، اس کا نصف ماہوار کر کے لیے جاتے ہیں، بے روزگار اور معذور سے نیز عورتوں اور بچوں سے کچھ نہیں لیا جاتا۔ خلفاء راشدین فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم سے یہی تفصیل منقول ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ اس ٹیکس کی مذکورہ مقدار میں کوئی شرعی تحدید نہیں، حالات کے بدلنے پر زمان ومکان کے لحاظ سے مملکت کے سربراہ کی صواب دید کے موافق اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے اور خاص صورتوں میں معاف بھی کیا جا سکتا ہے (اہل ذمہ کی یہ

دونوں قسمیں اور ان کے احکام کی تفصیل ہدایہ اور اس کی شرح فتح القدیر سے نقل کی گئی ہیں۔ (فتح القدیر مصری، ج:۱رص:۳۶۸)

فقہاء کرام نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر ان کو کافر کہہ کر مخاطب کرنے سے ان کی دل شکنی ہوتی ہو تو انہیں کافر کہہ کر خطاب کرنا بھی گناہ ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

لو قال ليهوديّ او مجوسيّ : يا كافر! يأثم اِن شقّ عليه۔

''اگر کسی یہودی یا مجوسی کو ''یا کافر!'' کہا تو اگر اُس پر یہ بات شاق گذرے تو گناہ ہوگا''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:۵رص:۳۴۸، کتاب الحظر والاباحۃ، باب:۴)

فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ غیر مسلم شہریوں پر ظلم کرنا مسلمانوں پر ظلم کرنے سے زیادہ سنگین معاملہ ہے؛ کیوں کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس سے معافی حاصل کرنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ (النوازل للفقیہ ابی اللیث، ص:۲۰۷)

اسلامی ریاستوں میں غیر مسلموں پر ایک ٹیکس عائد کیا گیا ہے جسے ''جزیہ'' کہتے ہیں، اور اس کی بنیاد پر بعض اوقات مغربی مصنفین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلامی ریاستوں میں غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے کہ ان پر وہ ٹیکس عائد کیا جاتا ہے، جو مسلمانوں پر عائد نہیں ہے؛ حالانکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بات ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے؛ بلکہ مجموعی اعتبار سے یہ ان غیر مسلموں کے حق میں جاتی ہے، وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہے اور غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، زکوٰۃ کی شرح یعنی کم سے کم ڈھائی فی صد اور زیادہ سے زیادہ دس فی صد وہ ہمیشہ جزیہ سے کہیں زائد ہوتی ہے، دوسری طرف اسلامی حکومت نہ صرف غیر مسلموں کے جان ومال کے تحفظ کی ذمہ داری لیتی ہے؛ بلکہ ان میں جو لوگ غریب ونادار ہوں ان کو بیت المال سے امداد بھی فراہم کرتی ہے۔ (النوازل للفقیہ ابی اللیث، ص:۳۱۱-۳۱۰)

(۲) مستأمن

وہ غیر مسلم جو کسی دوسری مملکت کا باشندہ ہے اور تجارت یا کسی دوسری غرض سے عارضی طور پر اجازت لے کر اسلامی مملکت میں آیا ہے اس کو مستأمن کہا جاتا ہے۔ اسلامی قانون اس کے بارے میں یہ ہے کہ اس کو ایک سال سے زیادہ قیام کی اجازت (ویزا) نہیں دیا جاتا (۲) اس پر کوئی ذاتی ٹیکس نہیں لگایا جاتا (۳) تجارتی ٹیکس اسی شرح سے لیا جاتا ہے جس شرح سے ان کی مملکت مسلمانوں سے وصول کرتی ہے۔ (۴) اور اگر ان کی مملکت مسلمانوں پر ظلم کرے اور پورا مال چھین لے تو اسلامی مملکت اس کا انتقام اپنے یہاں آنے والے سے نہیں لیتی؛ بلکہ اپنے قانون کے مطابق تجارتی عشر وصول کرتی ہے (۵) مستأمن کی جان، مال، آبرو وغیرہ کی حفاظت اسلامی مملکت پر ایسی ہی فرض ہوتی ہے جیسا کہ مسلمانوں اور باشندگان ملک ذمیوں کی حفاظت فرض ہے۔ (ہدایہ وغیرہ)

(۳) معاہد یا حلیف

وہ غیر مسلم جو اپنی مملکت میں رہتے ہوئے اسلامی مملکت سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ جو معاہدہ جن شرائط پر ان سے کرلیا گیا ہے، اس کی پابندی ظاہری اور باطنی طور پر پوری کی جائے۔ آج کل کی سیاسی دانش مندی کی طرح سے اس کو کسی طرح مجروح نہ کیا جائے۔ حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا:

مَن کانَ بَیْنَه وَبَیْنَ قومٍ عَھْدٌ فلا یَشُدُّ عَقْدَه وَلَا یَحُلُّها حتیٰ ینقضِیَ أمَرُھا وَیَنْبِذَ اِلَیْهِ عَلیٰ سَواءٍ ۔ رواہ احمد وابوداؤد عن عمروبن عبسة (کنز العمال ص:۲۷۰، ج:۲)

جس شخص اور کسی قوم کے درمیان کے کوئی عہد (التواء جنگ کا) ہو تو اس کو لازم ہے کہ جنگ کی تیاری کے لیے ایک گرہ بھی نہ باندھے نہ کھولے جب تک میعاد التواء گذر جائے یا دستور کے موافق معاہدہ ختم نہ کردیا جائے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ رومیوں سے جنگ کے موقع پر ارادہ کیا تھا کہ التواء جنگ کے زمانے میں اپنا لشکر سرحد روم پر پہونچا دیں اور میعاد ختم ہوتے ہی ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اسلامی لشکر روانہ ہو رہا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ کے کان میں پیچھے سے آواز آئی قِفُوا عِبَادَاللّٰہِ۔ اے اللہ کے بندو! ٹھہرو، امیر معاویہؓ ٹھہرے اور سبب دریافت کیا تو عمرو بن عبسہؓ نے مذکورالصدر حدیث سنا کر حضرت معاویہؓ کو ان کے اس اقدام سے روکا، حضرت معاویہؓ نے اس حدیث پر مطلع ہوتے ہی لشکر کو واپس ہوجانے کا حکم دے دیا۔ (ابوداؤد)

(۴) حربی

وہ غیر مسلم جس سے مذکورہ الصدر اقسام معاہدات میں سے کسی قسم کا معاہدہ نہ ہوا اسلام نے ان کے بھی عام انسانی حقوق کی رعایت کا حکم دیا ہے کہ عین میدان کارزار میں بھی عورت اور بچے کو قتل نہ کیا جائے، بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے۔ ان کے مذہبی پیشوا جو عبادات میں مشغول ہوں ان کو نہ مارا جائے۔ قتل صرف اس کو کیا جائے، جو قتال کرنے کے لیے سامنے آئے اور اس کی بھی ناک کان کاٹ کر صورت نہ بگاڑی جائے۔ ان چار قسموں میں غور کیا جائے تو ابتدائی تینوں قسمیں معاہدین کی ہیں، معاہدہ کیفیات وحیثیت مختلف ہونے کی وجہ حضرات فقہاء نے سہولت تعبیر کی غرض سے ان کے تین نام رکھ دیئے ہیں؛ لیکن احادیث نبویہ میں معاہد کا لفظ ان تینوں پر یکساں بولا جاتا ہے جیسا کہ روایات احادیث مذکورہ سابقہ میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ (ماخوذ از جواہر الفقہ ، ص:۲۹۱ تا ۲۹۴)

مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے سلسلے میں اسلامی ہدایات

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار مظالم کے پہاڑ توڑ رہے تھے، ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا، ہر طرح سے ان کو پریشان کیا جارہا تھا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ چلے جانے کے بعد بھی سکون میسر نہ آیا اور کفار، یہود اور منافقین کی مشترکہ سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مدینے کو تاخت وتاراج کرنے اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے ارادے سے ایک لشکر جرار نے مدینے پر چڑھائی کر دی، اس انتہائی مجبوری کی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ تلوار کا مقابلہ تلوار سے کیا جائے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت دی اور فرمایا:

''حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، وہ لوگ جن لوگ کو نکالا گیا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے''۔ (سورہ حج:۳۹)

جہاد کی اجازت ظلم وستم کے مقابلے کے لیے دی گئی اور برسرِ پیکار لوگوں کے سلسلے میں بے نظیر رواداری اور حسن اخلاق کی تعلیم بھی دی گئی، جو کسی بھی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی، چناں چہ اس سلسلے میں ہدایات درج ذیل ہیں:

۱۔ جنگ میں خود پیش قدمی سے روکا۔ (بقرہ:۱۹۱)

۲۔ ظلم وزیادتی کی ممانعت کی۔ (بقرہ:۱۹۰)

۳۔ جنگ کی بس اس وقت اجازت دی جب تک فتنہ وفساد فرو نہ ہو جائے۔ (حج:۱۳۹)

۴۔ دشمن کے قاصدوں کو امن دیا۔ (البدایہ والنہایہ:۳/۴۷)

۵۔ دشمن کی عورتوں، بچوں اور معذوروں کو مارنے سے منع کیا۔ (تاریخ ابن خلدون:۲/۴۸۹)

۶۔ سرسبز کھیتوں اور پھل دار درختوں کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی۔ (تاریخ ابن خلدون:۲/۴۸۹)

۷۔ عبادت گاہوں کو ڈھانے اور تارک الدنیا عابدوں اور مذہبی رہنماؤں کو قتل

کرنے سے روکا۔ (تاریخ ابن خلدون:۲/۴۸۹)

۸۔ اسیران جنگ کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت فرمائی۔

۹۔ دشمن اپنے کو کمزور دیکھ کر ہی صلح کی درخواست کرے تو بھی اسے قبول کرنے کی ہدایت فرمائی۔

۱۰۔ پناہ میں آنے والے غیر مسلم کو امن دینے اور عافیت سے رکھنے کی تاکید فرمائی۔ (توبہ:۳۶)

۱۱۔ محض مال غنیمت کے لیے جہاد کرنے سے روکا۔ (ابوداؤد:۱/۳۴۸)

۱۲۔ لوٹ کے مال کو حرام قرار دیا۔ (تاریخ ابن خلدون)

۱۳۔ معاہدہ کرنے والے ذمیوں کی جان ومال کی پوری حفاظت کا مسلمانوں کو پابند بنایا۔ (فتوح البلدان، بہ حوالہ دین رحمت:۲۳۹)

غیر مسلم برادرانِ وطن کے ساتھ تعلقات کی حدود

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرّہ نے نہایت جامع انداز میں غیر مسلمین کے ساتھ تعلقات کی مختلف شکلوں پر روشنی ڈالی ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بہت سی آیات قرآنیہ میں مجمل اور مفصل طور پر مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ موالات اور دوستی اور محبت سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے، ان تصریحات کو دیکھ کر حقیقتِ حال سے ناواقف غیر مسلموں کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں غیر مسلموں سے کسی قسم کی رواداری اور تعلق کی؛ بلکہ حسن اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں، اور دوسری طرف اس کے بالمقابل جب قرآن کی بہت سی آیات سے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وعمل سے نیز خلفاء راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے تعامل سے غیر مسلموں کے ساتھ احسان وسلوک اور ہمدردی وغم خواری کے احکام اور ایسے ایسے واقعات

ثابت ہوتے ہیں، جن کی مثالیں دنیا کی اقوام میں ملنا مشکل ہے تو ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی اس جگہ قرآن وسنت کے احکام وارشادات میں باہم تعارض اور تصادم محسوس ہونے لگتا ہے؛ مگر یہ دونوں خیال قرآن کی حقیقی تعلیمات پر طائرانہ نظر اور ناقص تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں، اگر مختلف مقامات سے قرآن کی آیات کو جو اس معاملے سے متعلق ہیں جمع کر کے غور کیا جائے تو نہ غیر مسلموں کے لیے وجہ شکایت باقی رہتی ہے، نہ آیات وروایات میں کسی قسم کا تعارض باقی رہتا ہے؛ اس لیے اس مقام کی پوری تشریح کردی جاتی ہے جس سے موالات اور احسان وسلوک یا ہمدردی یا غم خواری میں باہمی فرق اور ہر ایک کی حقیقت بھی معلوم ہوجائے گی اور یہ بھی کہ ان میں کونسا درجہ جائز ہے کونسا ناجائز؟ اور جو ناجائز ہے اس کی وجوہ کیا ہیں؟۔

بات یہ ہے کہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں ایک درجہ تعلق کا قلبی موالات یا دلی مودت ومحبت ہے، یہ صرف مومنین کے لیے مخصوص ہے، غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے، جس کے معنی ہیں ہمدردی وخیر خواہی اور نفع رسانی کے، یہ بجز کفارِ اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں، باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

سورہ ممتحنہ کی آخری آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی، آیت کریمہ کا ترجمہ ہے:

"اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا ان سے، جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا سلوک کرو"۔

تیسرا درجہ مدارات کا ہے، جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہونچانا ہو یا وہ اپنے مہمان ہوں یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ

کو بچانا مقصود ہو، سورہ آل عمران کی آیتِ مذکورہ میں "اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً" سے یہی درجہ مدارات کا مراد ہے، یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں؛ مگر ایسی حالت میں جب کہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چوں کہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے؛ اس لیے اس کو موالات سے مستثنٰی قرار دے دیا گیا ہے۔(بیان القرآن)

چوتھا درجہ معاملات کا ہے، کہ ان سے تجارت یا اجرت وملازمت اور صنعت وحرفت کے معاملات کیے جائیں، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ اور دوسرے صحابہؓ کا تعامل اس پر شاہد ہے، فقہاء نے اسی بنا پر کفار اہلِ حرب کے ساتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ قلبی اور دلی دوستی ومحبت کی تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں گنجائش نہیں اور احسان وہمدردی ونفع رسانی بجز اہل حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس کا مقصد مہمان کی خاطر داری یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی نفع پہونچانا یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان وضرر سے بچانا ہو۔ (معارف القرآن، ج:۲ر ص:۵۱-۵۰)

خلاصہ یہ ہے کہ ایسی قلبی دوستی کو چھوڑ کر جس سے مسلمان اور غیر مسلم کے مقاصدِ زندگی کا فرق ہی مٹ جائے غیر مسلموں کے ساتھ مصالحت، امن کے معاہدات، انسانی بنیادوں پر ہمدردی، غم خواری، حسنِ سلوک اور مشترک انسانی بھلائی کے لیے باہمی تعاون کی نہ صرف اجازت ہے؛ بلکہ اسے پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

بھلائی کے کاموں میں تعاون

اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن وسنت میں بھلائی کے کاموں میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعاون کی نہ صرف اجازت؛ بلکہ اس کی ترغیب دی ہے، قرآن کریم نے اس سلسلے میں دوٹوک اصول یہ بیان فرمادیا ہے کہ:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

یعنی: ''اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون مت کرو''۔

یہ اصول قرآن کریم نے جس سیاق میں بیان فرمایا ہے وہاں غیر مسلموں ہی کے خلاف زیادتی کا ذکر ہے، آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور کسی قوم کے ساتھ تمہاری یہ دشمنی کہ انھوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم (ان پر) زیادتی کرنے لگو اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون مت کرو''۔ (سورہ مائدہ:۲)

لہٰذا اس میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی نیکی میں تعاون کا حکم شامل ہے اور اگر غیر مسلم کوئی ایسا منصوبہ پیش کرے، جو عام انسانی فائدے کا ہو اور اس میں کوئی بات اسلامی شریعت اور مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف نہ ہو، تو مسلمانوں کے لیے ایسے منصوبے میں شرکت بھی جائز؛ بلکہ مستحسن ہے۔

دیگر مذاہب والوں کے ساتھ تعاون کا اسلامی اصول

موجودہ ملکی حالات میں اس بات کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ مسلمان دین وشریعت کی مضبوط راہ پر چلیں اور زندگی کا ہر لمحہ شریعت کی رہنمائی، پیشوائی

میں گذاریں اور جہاں تک ہو سکے خدا کے دین کے فیوض وبرکات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے جتن اور لگن سے کام لیں۔ اس کام کے واسطے ہمارے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ تعاون واشتراک اور عدم تعاون کے اسلامی اصولوں سے واقف ہوں اور اپنے اکابر واسلاف رحمہم اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک میں پرامن بقائے باہمی اور برادرانِ وطن کے ساتھ ہمدردی، انسانیت نوازی اور رواداری کا برتاؤ رکھیں۔

جنگ آزادی کے دوران دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے اکابرؒ نے ملک میں رہنے والے برادرانِ وطن کے ساتھ سماجی تعلقات اور موالات کے حدود اور مسائل کو پوری طرح منقح کر کے بیان کیا تھا۔ اسلام نے برادرانِ وطن کے ساتھ خوش گوار سماجی تعلقات کے فروغ کے موثر احکامات دیے ہیں، دین دعوت ہونے کے ناتے اس نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ملک وسماج میں فرقہ وارانہ نفرت کا ماحول پیدا نہ ہونے پائے؛ کیوں کہ اس سے اسلام کے فیوض وبرکات کے پھیلنے میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے پڑوسیوں کے حقوق کی اہمیت بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

''وہ مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھانا کھالے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے۔'' (مشکوۃ شریف: کتاب الآداب)

ایک روایت میں نبی کریم ﷺ نے تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ:

''وہ مومن نہیں، جس کے شر سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو''۔

(بخاری شریف، کتاب الادب، عن ابی شریحؓ)

ان روایتوں میں مسلم اور غیر مسلم کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ تمام پڑوسی مراد ہیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی دین ومذہب کو مانتے ہی نہ ہوں۔ بخاری ومسلم کی ایک طویل روایت میں آں حضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ

کو ریشمی جوڑا تعلق والے غیر مسلم کو تحفے کے طور پر دینے کی اجازت دی ہے، حالانکہ مسلمان مرد کے لیے ریشمی جوڑے کا استعمال حرام ہے، بخاری کے کتاب الجنائز میں ایک روایت آتی ہے، جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ تعلق رکھنے والے ایک بیمار یہودی لڑکے کی آں حضرت ﷺ نے عیادت فرمائی تھی۔

ذخیرۂ حدیث میں اس قسم کی بے شمار روایتیں ہیں، جن سے دیگر مذاہب والوں کے ساتھ سلوک پر روشنی پڑتی ہے، ہمارے فقہاے اسلام نے اس پر بہت مدلل و مفصل بحثیں کر کے مسئلے کے ہر پہلو کو بالکل منقح کر دیا ہے، دیگر مذاہب والوں کے ساتھ تعاون وعدم تعاون کے سلسلے میں اسلامی اصول یہی ہے کہ ان کے ساتھ مشترک سماجی وملکی مسائل اور ان معاملات میں جن میں شرعی نقطۂ نظر سے اشتراک وتعاون کرنے میں کوئی ممانعت نہ ہو، ان میں ساتھ دینا چاہیے، جیسا کہ جنگ آزادی کے دوران ہمارے اکابرؒ نے کیا۔ اگر ہمارا پڑوسی، چاہے وہ گھر کے لحاظ سے ہو یا وطنی اشتراک رکھتا ہو، کسی مسلمان سے ایسے تعاون کا خواہش مند ہو، جو شرک وکفر کے ذیل میں آتا ہو، تو یہاں عدم تعاون کی راہ اختیار کی جائے گی؛ لیکن سماجی سطح پر نیک سلوک اور خوش گوار تعلقات بنائے رکھنے میں ہر ممکن راہ اپنائی جاسکتی ہے، اس سلسلے میں معاہدۂ مدینہ روشن نمونہ ہے۔

جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں اور اہل مدینہ (یہودی وغیرہ) کے درمیان جو معاہدہ کرایا تھا اس کی متعدد دفعات میں دشمنوں کے مقابلے میں مشترک مسائل میں ایک ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ مسلمانوں اور مدینے کے باشندوں کو وطنی حیثیت سے ایک گروہ قرار دیا گیا ہے۔ انهم امة واحدة (دیکھئے سیرت ابن ہشام جلد اول اور کتاب الاموال)

مفتی اعظم ہند حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ، اولینِ صدر جمعیۃ علماء ہند اپنے ایک اہم فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

''جنگ آزادی تَخلُّص من ید الظالم ہے اور اس کے لیے غیر مسلم سے تعاون اور اشتراک عمل کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، اگر گاؤں پر ڈاکو حملہ آور ہوں تو گاؤں کی مسلم وغیر مسلم آبادی باہم تعاون واشتراک عمل کر کے ان کے حملے سے اپنے گاؤں اور اپنی جانوں کو بچاسکتی ہے اور مسلم آبادی پر ایسے غیر مسلموں سے اشتراک عمل کرنا کسی درجے میں ناجائز اور مذموم نہیں ہے۔''

(حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ ایک مطالعہ ۲۰۷)

ایک اور سوال کے جواب میں حضرت مفتی اعظمؒ نے تحریر فرمایا ہے:

(۱) ''اسلامی امور میں غیر مسلم کی سرداری قبول کرنی درست نہیں ہے۔ سیاسی امور یا اقتصادیات میں غیر مسلموں کی شرکت یا ان کی صدارت میں کام کرنا یا کسی مجبوری سے ان کی قیادت تسلیم کرنا منع نہیں، جیسے میونسپلٹیوں میں غیر مسلم کی چیر مینی یا کونسلوں میں غیر مسلم کی پریزیڈنٹی یا پولیس کی ملازمت میں غیر مسلم افسر کی اطاعت یا دکان میں غیر مسلم کی شرکت یا انگریزی حکومت اور اس کے قانون کی تعمیل کرنا، غیر مسلم ڈاکٹر یا طبیب کی ہدایت پر عمل کرنا۔

(۲) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے ایک دوسرے کی اعانت کا معاہدہ کیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بھی معاہدات ہوئے۔ شاہانِ اسلام کے زمانے میں بہت سے غیر مسلم افسر اور عہدے دار ہوتے رہے ہیں۔

(۳) غیر مسلم حکومت کی قوت اور تسلط کو دفع کرنے اور عالم اسلامی کو ان نقصانات عظیمہ سے بچانے کے لیے، جو انگریزی طاقت دولِ اسلامیہ اور اقوامِ مسلمہ کو پہنچا رہی ہے۔ ہندوستانی قوم کا سیاسی طور پر مل کر کام کرنا مَنُ اُبْتُلِیَ بِبَلِیَّتَیْنِ فَلْیَخْتَرْ أَهْوَنَهُمَا (حدیث) کے ماتحت جائز ہے۔ (حضرت مفتی) محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی۔ (ایضاً، ص:۲۱۱)

وطن کی محبت اسلام میں

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو دنیا میں جینے اور زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیشہ ہی غذا کی ضرورت پڑتی ہے، انسان کو یہ غذا زمین سے حاصل ہوتی ہے اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے، سورہ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا''۔(سورہ حج)

دوسری آیت شریفہ میں ارشاد فرمایا ہے:

''ہم نے تم کو زمین میں ٹھہرایا اور تمہارے لیے زندگی کے سامان زمین سے پیدا کیے''۔(سورہ اعراف)

دوسری آیت کریمہ میں ارشاد ربانی ہے:

''تم زمین میں ہی زندگی بسر کروگے اور زمین میں ہی مروگے اور زمین میں سے ہی نکالے جاؤگے''۔(سورہ اعراف)

جس زمین سے آدمی کا خمیر اٹھا ہے، جہاں وہ پیدا ہوا اور زندگی بسر کررہا ہے، اس سے انسان کو فطری لگاؤ اور تعلق ہوتا ہے؛ اسی لیے عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے:

''انسان کی پیدائشی سرزمین اس کی دودھ پلانے والی ماں ہے''۔

مشہور حکیمانہ جملہ ہے:

" حب الوطن من الایمان"۔ وطن کی محبت ایمان کا تقاضا ہے۔

سرورِ عالم ﷺ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ سے جانے لگے تو فرمایا کرتے تھے:

''اے مکہ! تو خدا کا شہر ہے، تو مجھے کس قدر محبوب ہے، اے کاش! تیرے باشندے مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو میں تجھ کو نہ چھوڑتا''۔(جمع الفوائد:۱/۱۹۵)

جب سرورِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو وطن بنالیا تو دعا میں فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! ہمارے اندر مدینے کی اتنی محبت پیدا کردے، جتنی تو نے مکہ

کی محبت دی ہے، مدینے کی آب وہوا درست فرمادے اور ہمارے لیے مدینے کے صاع اور مد (ناپنے کے پیمانے) میں برکت عطا فرما اور مدینے کے بخار کو جحفہ (مقام) کی طرف منتقل فرمادے''۔(بخاری شریف:۱/۵۵۸)

اس حدیث شریف سے وطن عزیز کی محبت کا بھی بہ خوبی پتہ چلتا ہے، نیز اس کی اقتصادی ترقی اور آب وہوا کی درستگی اور صحت وعافیت کی بہ حالی کی شدید رغبت بھی ظاہر ہوتی ہے؛ اس لیے وطن مالوف کی محبت فطری تقاضا بھی ہے اور شرعی بھی۔

ہندوستان کی فضیلت

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ، صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علمائے ہند رقم طراز ہیں:

''اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی سکونت کی، اور یہاں سے ہی ان کی نسل دنیا میں پھیلی اور اسی وجہ سے انسانوں کو ''آدمی'' کہا جاتا ہے''۔(ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل، بحوالہ تفسیر ابن کثیرؒ:۱/۸۰)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان نبوت کا دارالخلافہ ہے، یہاں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تشریف لائے، حضرت شیث علیہ السلام دوسرے رسول تھے، جو اس سرزمین پر وارد ہوئے، ان کی قبر شریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اجودھیا میں ہے''۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ''رام چندر جی'' اور ''کرشن جی'' کے نام ادب

سے لیے جائیں اوران کے ساتھ گستاخی نہ کی جائے۔(قومی اتحاد،ص:۷)

حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(۱)انسانیت کا دارالخلافہ ہندوستان ہے۔

(۲) چوں کہ خلیفہ نبی تھا جس کے پاس حضرت جبرئیلؑ تشریف لایا کرتے تھے،لہذا سرزمینِ ہند سب سے پہلے آفتاب نبوت کا مشرق بنی۔

(۳)اسی سرزمین پر سب سے پہلے حضرت جبرئیل کا نزول ہوا۔

(۴)ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے جسم کا خمیر ''وجنی'' نامی علاقے کی خاک سے بنایا ہے، لہذا ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ سب سے پہلے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خمیر یہیں کی خاک سے بنایا گیا اور حضرت آدم تمام انسانوں کے ابوالآباء تھے؛ اس لیے جملہ انبیاء اور تمام انسانوں کے روحانی اور مادّی اصل واصول کا خمیر ہندوستان ہی سے بنایا گیا،توالد وتناسل کے اصول پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جملہ انبیاء،اولیاء اور صلحاء کرام،علماء ومشائخ کا اوّلین عنصر اسی خاک پاک سے وجود پذیر ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ''عہد الست'' ہندوستان کے مقام ''وجنی'' میں ہی لیا گیا۔اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی روحوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے برآمد کر کے ان کو خطاب کیا اور فرمایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تمام روحوں نے متفقہ طور پر اللہ کی پروردگاری کو تسلیم کرتے ہوئے کہا،ضرور! آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں۔(ہمارا ہندوستان اوراس کے فضائل)

وطن عزیز میں مسلمانوں کے ملکی فرائض

محدث عصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ سابق صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

''ہندوستان یا کسی دوسرے غیر مسلم اکثریت والے ملک میں ہر مسلمان اس بات کا ذمہ دار ہے، کہ اسلام نے عام انسانوں کے لیے امن اور آزادی کے جو حقوق تسلیم کیے ہیں، اپنے اختیار اور اپنی طاقت کی حد تک ان حقوق کی حفاظت کرے، ظاہر ہے اس مقصد کے تحت ہر مسلمان کو ملک کی سیاسی، معاشی اور شہری سرگرمیوں میں بقدر طاقت حصہ لینا پڑے گا، تا کہ اپنے ہاتھ میں سیاسی اور معاشی قوت کے ذریعے وہ ملک کے عام باشندوں کی جان ومال اور روٹی کپڑے کے حقوق کی حفاظت کا اپنے وسائل کی حد تک فرض انجام دے سکے۔ایک مسلمان اگر محض تماشائی بن کر زندگی گذارنا چاہے اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں اور معاشی واقتصادی جدوجہد سے کنارہ کش رہے تو وہ خدا کے عام بندوں کی خدمت کا فرض کیسے ادا کرسکتا ہے''۔(ہندوستان میں مسلمانوں کے ملکی فرائض)

ہمارے اکابر علماء کرام اور عام مسلمانوں نے ہمیشہ ملک میں محبت واتحاد، حسن معاشرت، فرقہ وارانہ یگانگت اور قومی یک جہتی ورواداری کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''ہم باشندگانِ ہندوستان بہ حیثیت ہندوستانی ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں، جو کہ اختلافِ مذاہب اور اختلافِ تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے، جس طرح ہماری صورتوں کے اختلافات ذاتوں اور صورتوں کے تباین، رنگتوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترکہ انسانیت میں فرق نہیں آتا، اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں۔

لہذا وطنی منافع کے حصول اور مضرتوں کے ازالے کی فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے، جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا، اس کے لیے سب کو مل کر پوری طرح کوشش کرنی ازبس ضروری

ہے، اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں تو تمام گاؤں برباد ہو جائے گا، اور سبھی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑ جائے تو مشترکہ قوت سے اس کے دور کرنے کی جد وجہد کریں، اشتراک وطن کے فرائض سب پر یکساں عائد ہوتے ہیں، مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، ہر ایک اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کے ایسے فرائض کو انجام دے سکتا ہے، یہی اشتراک، میونسپل بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے، اور مختلف المذاہب ممبران فرائضِ شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ متحدہ قومیت کے ہیں۔ (ماخوذ از خطبات فدائے ملت، ص: ۲۱۵، ۲۱۶)

ہندوستان حضرت مجاہد ملت کی نظر میں

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ مرحوم اپنی تقریروں میں موجودہ انسانی دنیا کا اور خصوصاً اپنے پیارے وطن کا موازنہ ایک ایسے باغ کے ساتھ کیا کرتے تھے جس میں الگ الگ رنگوں اور الگ الگ خوشبوؤں کے پھولوں کی الگ الگ کیاریاں اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی خوشبو سے پورے باغ کی زینت اور اس کی شان کو بڑھاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تمثیلیں خاص حدود کے اندر ہی درست مانی جاسکتی ہیں؛ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ خیال قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اور مشیت ایزدی کی سچی تصویر ہے۔ اس حکم کے خلاف تخیل اور عمل کی کوشش مشیت ایزدی میں مداخلت اور ''لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔

آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس اور شعور پیدا ہو۔ اس پیارے دیش کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم برابر کے شریک و سہیم اور اس دعوت حق کے علم بردار ہیں، جو پورے عالم انسانیت کے لیے امن ورحمت کا پیغام اور ہمدری وخیر سگالی کا سرچشمہ ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس ملک میں ہماری زندگی کسی اجنبی اور تماشائی کی زندگی نہیں ہوسکتی۔ اس کے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے؛ اس لیے ملی جلی وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لیے جائز نہیں ہوسکتی۔ ہمارا تو یقین یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر وطن کی سچی محبت اور اپنے ذہن ومنصب کا صحیح احساس بیدار ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اپنے حقوق سے زیادہ دیر تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ ان الله مع الذين اتقوا والذين هم المحسنون۔ (**اللہ کی مدد ہمیشہ ان کے** ساتھ ہوتی ہے، جو کردار وعمل کے کھرے اور نیکوکار ہوں۔) (مجاہد ملت، ص: ۴۷۳)

دسمبر ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں منعقد مسلمانانِ ہند کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مجاہد ملتؒ نے فرمایا:

> ہم کسی جماعت یا پارٹی کے وفادار نہیں ہیں، ہم صرف ملک اور وطن کے وفادار ہیں، اگر کوئی جماعت، پارٹی یا حکومت ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے، تو ہم اسے بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جماعت یا پارٹی یا حکومت غلط راستوں پر جائے، تو ہمارا کام اس کو سیدھا کرنا یا الٹ دینا ہے، جو افراد یا جماعتیں ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہیں، ہم ان سے ملک کی وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں، وہ لوگ فرقہ پرستی، تنگ نظری یا تعصب پیدا کرتے ہیں، وہ ملک کے غدار اور وطن کے دشمن ہیں۔ ان کو کسی دوسرے سے وفاداری کے مطالبے کا کوئی حق نہیں، وہ خود اپنی وفاداری کا امتحان دیں''۔ (مجاہد ملت، ص: ۹۷)
>
> ہم اس ملک میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان (یہ تعداد ۱۹۴۷ء

کی ہے، اب تعداد ایک اندازے کے مطابق ۲۰ رکروڑ ہے) یہاں اس لیے نہیں ہیں، کہ کسی کی چاپلوسی کریں یا یہ سمجھیں کہ اس سے ہندو خوش ہوگا یا پنڈت نہرو خوش ہوں گے، اگر جمعیۃ کے خدام کے دل میں ایک منٹ کے لیے بھی ایسا خیال گزرے تو میں کہوں گا کہ اس سے بڑی بزدلی اور نفاق کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ جس طرح یہ ملک اکثریت کا ہے، اسی طرح اقلیت کا بھی ہے۔ جس طرح ہندو کا ہے، اسی طرح مسلمان کا بھی ہے۔ جس طرح پنڈت نہرو کا ہے، اسی طرح حفظ الرحمٰن کا بھی ہے۔ یہ ایک جمہوری ملک ہے''۔(ایضا)

ہندوستان اور سیکولرازم

حضرت نے مزید فرمایا: ''۱۴ر برس گزر گئے کہ ہم نے اپنا سیکولر آئین بنایا، سیکولر کے معنی بہت سے لیے جاتے ہیں۔ کوئی اس کے معنی لادینی حکومت لیتا ہے، کوئی ایسی حکومت کے لیتا ہے جو تمام مذاہب کو ختم کردے گی؛ لیکن ہم اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر یہاں کا دستور اور قانون ملک کے بسنے والوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کرے گا۔ اس ملک میں بسنے والی چھوٹی سے چھوٹی ۳ر آدمیوں کی اقلیت کو بھی وہی حق حاصل ہوگا، جو یہاں کی نوے فیصدی اکثریت کو حاصل ہوگا۔ مذہب یا کسی اور بنیاد پر کسی کا حق نہیں دبایا جائے گا۔ ہم نے یہ دستور اپنے لیے بنایا ہے اور اسی دستور نے یہاں کے ہر بسنے والے کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا دستوری حق طلب کرے۔ ہمیں اس بات کا طعنہ کیوں دیتے ہو کہ پاکستان میں تو سیکولر دستور نہیں ہے؟ ہم نے پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کی مخالفت کی، ہم آخر تک تقسیم وطن کے خلاف رہے؛ لیکن جب پاکستان ایک ملک بن گیا ہے، ہم بھی چاہتے ہیں کہ پاکستان والے اپنے ملک میں خوش رہیں؛ لیکن ان کے کسی فعل کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، ہم پر تو صرف اپنے فعل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم نے ایک سیکولر جمہوری نظام کو اپنایا ہے، یہاں کا ہر بسنے والا

برابر کا حق رکھتا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو ہم جائزہ لیں کہ پارلیمنٹ میں جو قانون بنایا گیا وہ ہم پر کسی کا رحم وکرم نہیں۔ وہ ہندوستان کی وہ تاریخ ہے، جس کے پیچھے اگر جلیاں والا باغ ہے تو قصہ خوانی بازار بھی ہے''۔(ایضاً، ص:۴۴۸-۴۴۹)

برادرانِ وطن کے ساتھ مسلمانوں کا پرامن بقائے باہم

ہم برادرانِ وطن کے ساتھ میل ملاپ کو اپنی شناخت کھونے کے بجائے اقوامِ عالم کی صف میں امتِ مسلمہ کی شان امتیاز سمجھتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور عالمی انسانی برادری کے ممبر بھی اور دونوں حیثیتوں میں کوئی تضاد نہیں؛ بلکہ ہماری آفاقیت ہمارے اسلام کی مرہونِ منت ہے۔

اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ جو جمعیۃ علماء ہند کے اکابر میں عبقری شخصیت کے حامل ہیں، انھوں نے ہندوستان کے تناظر میں جو بات کہی وہ آج ملکی و بین الاقوامی حالات میں مسلمانوں کی حیثیت اور ان کے کردار و شناخت کے تئیں بہت ہی موزوں ہے، جس کا لب لباب یہ ہے:

> میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی چودہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ ،اسلام کے علوم وفنون ،اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے؛ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی؛ بلکہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی

ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین یعنی بناوٹ کا ایک ناگزیر عامل (فیکٹر) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا‘‘۔

اس متحدہ قومیت کے عناصر وعوامل یکساں اور مساوی طور پر آپ کے تمام برادرانِ وطن، بلا لحاظِ مذہب وملت، نسل ورنگ سب کے سب ہیں۔ مذہب اور کلچر کے لحاظ سے ان کے درمیان جو فرق واختلاف ہو اور آپ اپنے روایتی ورثے پر الگ الگ جتنا بھی فخر کریں، جس طرح چاہیں پوری آزادی، بے خوفی، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اس ورثے کے تحفظ وترقی کی زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کوشش کریں۔ اس سلسلے میں اسلام کی روح خود اس راہ میں رہنمائی کرتی اور ملک کی فلاح وترقی کی جد وجہد میں اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب سد راہ نہیں ہوتی، بلکہ مدد ومعاون ہوتی ہے؛ اس لیے کہ ملک میں اس کی تعلیم، اس کی تاریخ، ان علوم فنون اور اس تہذیب کا فروغ بھی اسی وقت ممکن ہے، جب ملت اسلامیہ کے افراد اہلِ وطن کے ساتھ مل کر اپنے محبوب وطن کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں ہوں۔

مسلم حکمرانوں کی رواداری کے واقعات

امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰؒ کی رواداری

اندلس میں مسلمانوں نے سب سے پہلے مذہبی آزادی کا اعلان کیا تھا اور عیسائیوں کو اپنے مذہبی ودنیوی معاملات میں ہر قسم کی آزادی عطا کردی تھی، بشرطے کہ وہ اسلام اور حکومتِ اسلامیہ سے معترض نہ ہوں، اب اندلس کے دوسرے والی عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر (حکومت: ۹۵ھ تا ۹۷ھ) نے اسی سلسلہ میں اعلان کیا کہ جو غلام اسلام قبول کرے گا وہ مسلمان ہوتے ہی اپنے غیر مسلم آقا کی غلامی وقید سے آزاد سمجھا جائے گا،

عیسائیوں کے پاس غلاموں کی بڑی تعداد تھی اور وہ ان غلاموں سے اس طرح خدمات لیتے تھے جیسے چوپایوں سے خدمات لی جاتی ہیں، امیر عبدالعزیزؒ کے اس اعلان کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہزارہا غلاموں نے آزادی حاصل کرنی شروع کی اور انسانی حریت سے بہرہ اندوز ہونے لگے، اس طرح نوعِ انسانی کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی گئی اور ساتھ ہی قلت تعداد کی شکایت بھی مسلمانوں کو نہ رہی۔ (تاریخ اسلام، ج:۳، ص:۴۰-۴۱)

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی رواداری

صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ (حکومت: ۱۱۳۷ء تا ۱۱۹۳ء-۵۳۲ھ تا ۵۸۹ھ) کو عیسائیوں کے وہ ظلم خوب یاد تھے جو انہوں نے بیت المقدس میں داخلے کے وقت مسلمانوں پر روا رکھے تھے، سلطان نے قسم کھائی تھی کہ میں بھی عیسائیوں کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا، عیسائی بھی اپنے اعمال سے بے خبر نہ تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ ہمارے بزرگوں نے آج (۵۸۲ھ) سے بانوے سال پیشتر کس قیامت کے ظلم وستم مفتوح اور مغلوب اور بے کس وبے بس مسلمانوں کے ساتھ کیے تھے، اس لیے ان کو اپنی بے دردانہ موت اور اپنی ذلت ورسوائی کا کامل یقین تھا، وہ خونی منظر جہاں شہداء کی لاشیں عرصہ تک بے گور وکفن پڑی رہیں، وہ گھر جہاں عفت اور عصمت کی پردہ دری اس وقت سلطان کی آنکھوں کے سامنے تھے، مگر اس نے یونانی اور شامی عیسائیوں کے سوا باقی تمام عیسائیوں کو زرِ مخلصی (جزیہ بشرح دس دینار فی مرد، پانچ فی عورت اور دو دینار فی بچہ) ادا کرنے کے بعد یروشلم سے نکل جانے کا حکم دیا، عیسائیوں کو ایسے نرم سلوک کی ہرگز توقع نہ تھی، انہوں نے بہت خوشی منائی (جان بچی لاکھوں پائے) لیکن جب میعاد مقررہ کے بعد بیت المقدس سے روانہ ہونے کا دن آیا تو انہوں نے رنج وغم کی وجہ سے مسیح کی قبر کو اپنے آنسوؤں سے تر کردیا، سلطان صلاح الدین ایک تخت پر بیٹھا ہوا عیسائیوں کی روانگی کی کیفیت دیکھ رہا تھا، ملکہ

بیت المقدس بہت سی عورتوں کے ہمراہ صلاح الدین کے پاس آ کر درخواست گزار ہوئی، کہ اگر ہمارے خاوند کو بھی رہا کردیا جاتا تو ہماری مصیبتیں کم ہوجاتی، سلطان نے اسے بھی منظور کرلیا، فرانسیسی مورخ چاڈ رقم طراز ہے کہ:

> ’’سلطان نے بچوں کو، ان کی ماں اور خاوندوں کو عورتوں کے پاس پہنچادیے، یہ وہ لوگ تھے جن کا زرفدیہ کسی نے ادا نہیں کیا تھا، سلطان کے بھائی ملک عادل نے دو ہزار قیدیوں کا زرِ مخلصی اپنے پاس سے ادا کر کے ان سب کو رہا کردیا، سلطان نے فرمایا: میرے بھائی نے اپنی خیرات کی ہے، میں خیرات کرتا ہوں کہ تمام معمر آدمی جو شہر میں ہیں آزاد کردیے جائیں، جب سلطان نے دیکھا کہ بعض اپنے کندھوں پر اپنے ضعیف والدین وغیرہ کو اٹھائے ہوئے ہیں، تو اس کا دل بھر آیا، ان کو اجازت دی، کہ شہر میں رہ کر حاجیوں کی خبر گیری اور خدمت کریں، کمزوروں اور معذوروں کی مدد وغیرہ کریں‘‘۔ (حیات صلاح الدین، ص:۱۲۴)

کیا اپنے دشمنوں کے ساتھ جنہوں نے عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو تہہ تیغ کیا ہو، اس قسم کی فیاضی و رواداری، ایسے رحم و احسان اور ایسے نیک سلوک کی نظیر دنیا کی کسی تاریخ میں بھی مل سکتی ہے؟ اسلام نے خاتمہ جنگ کے بعد خون ریزی کو جائز قرار نہیں دیا، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے سنتِ رسول پر عمل کیا اور عیسائیوں کو معاف کر کے اسلام کی لاج رکھ لی۔

ترکی خلیفہ سلطان محمد فاتح کی رواداری

عیسائیوں کو مذہبی اور ملّی آزادی

یکم جون ۱۴۵۳ء کو سلطان محمد فاتح (حکومت: ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء۔ ۸۵۵ھ تا ۸۸۶ء) نے امنِ عام کا اعلان کیا اور ان تمام عیسائیوں کو جو قسطنطنیہ سے

بھاگ گئے تھے واپس آنے کی دعوت دی، اس نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا اور انہیں آمادہ کیا کہ آ کر اپنے پیشوں اور کاروبار میں پھر بدستور مشغول ہوجائیں، اس کے بعد اس نے یونانی کلیسا کے بطریق (پادری) کو از سرِ نو اس کے عہدے پر مامور کیا اور کلیسا کی سرپرستی خود قبول کی، ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات، محترم قرار دی گئی، وہ اور نیز اس کے کلیسا کے دوسرے عہدے دار تمام ٹیکسوں سے بری کردیے گئے، اسی فرمان کے ذریعہ یونانیوں کے نصف گرجے انھیں واپس کردیے گئے اور ان کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی، اس فرمان میں سلطان نے انہیں اس امر کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے قومی معاملات اپنی ملی عدالتوں میں طے کرلیا کریں، ان عدالتوں کا صدر کلیسا کے بطریق ’’جارج گنادیس‘‘ (Gennadius) کو مقرر کیا، جو خود یونانیوں کا مقرر کردہ تھا، سلطان نے یونانیوں کے قانونِ نکاح اور قانونِ وراثت کو بدستور قائم رکھا اور ان کا نفاذ بطریق اور مذہبی عدالتوں کے سپرد کیا۔ پروفیسر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب ’’دعوتِ اسلام‘‘ میں سلطان محمد فاتح کی اس رواداری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ’’سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے کے بعد پہلا انتظام یہ کیا کہ خود یونانی کلیسا کا حامی اور سرپرست بنا؛ تاکہ عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں، عیسائیوں پر سختی ہونے کی ممانعت کردی اور یہ فرمان جاری کیا، جس کے بہ موجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق کو اس کے جانشینوں اور ماتحت اسقفوں کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے دیے گئے اور جو ذریعے ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے اور جن قواعد سے وہ مستثنیٰ تھے ان سے بدستور مستثنیٰ کیے گئے۔ گنادیوس کو، جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا سلطان نے اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت فرمایا جو اس کے

منصب کا نشان تھا، اور ایک خریطہ جس میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں اور ایک گھوڑا جس پر بہت تکلف کا سامان تھا اس کو دیا اور اجازت دی کہ وہ اپنے قدیم سامانِ جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے، ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا، کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اس کو عیسائی شہنشاہانِ روم کے وقت میں حاصل تھی؛ بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیے۔ بطریق قسطنطنیہ کی عدالت ایسے کل مقدمات کا جس میں فریقین مسیحی المذہب ہوں فیصلہ کرتی تھی، جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے لیے علاحدہ قید خانے بنے ہوئے تھے اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے دینے کا اختیار اس کو حاصل تھا، وزراء سلطنت اور ترکی حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں، سابق کی عیسوی سلطنت میں رعایا کے مذہبی امور میں طرح طرح کی دست اندازیاں کی تھی؛ لیکن ترکوں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا، بطریق اور اس کی مذہبی مجلس کو پورے اختیارات مذہب اور مذہبی انتظامات کے بارے میں حاصل ہوئے۔ بطریق مجاز تھا کہ مذہبی مشوروں کی مجلس کو جب چاہے جمع کرے اور اس کے ذریعے سے عیسوی فقہ اور اصول کے تمام مسائل کو بغیر سلطنت کی مداخلت کے طے کرے اور چوں کہ ایک حیثیت سے وہ سلطانی عہدے دار بھی تھا؛ اس لیے اس کے اختیار میں تھا کہ مصیبت زدہ عیسائیوں کی حالت کی اصلاح اس طرح کرے کہ ناانصاف ترکی گورنروں کے کاموں سے سلطان کو اطلاع کردے، یونانی اسقف جو اضلاع میں تھے ان کی بھی بہت عزت تھی، اور عدالت کے اختیارات ان کو اس قدر دیے گئے تھے کہ موجودہ زمانے تک انہوں نے اپنے علاقوں میں عیسائیوں پر ترکی حاکموں کی طرح حکومت رکھی''۔ (دعوتِ اسلام ترجمہ اردو،ص: ۱۶۵،۱۶۴)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

اسلام ہندوستان میں مسلمان تاجروں کے ذریعہ پہونچا، عرب تاجر ہندوستان کے مالا بار وغیرہ علاقوں میں پہلے پہنچے تھے، جہاں انہوں نے بود و باش اختیار کی، ان کی امانت و دیانت، صداقت اور خوش معاملگی سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ محمد بن قاسم نے ۹۳ھ میں سندھ سے ملتان تک کے علاقے کو فتح کر کے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

محمد بن قاسمؒ کی رواداری

محمد بن قاسم برہمنوں کی طرف زیادہ مائل ہوئے، ان کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا، کیونکہ انہیں خیال پیدا ہوگیا تھا، کہ یہ ایمان دار ہوتے ہیں، اس کے ساتھ دغا نہ کریں گے، انہوں نے ان کو عہدے یہ کہہ کر دئے کہ یہ نسلاً بعد نسلٍ تمہارے یہاں برقرار رہیں گے، دوسروں کو نہیں دئے جائیں گے، اس کا اچھا اثر یہ پڑا کہ یہ برہمن علاقے میں ہر جگہ جا کر یہ کہنے لگے، کہ اگر یہاں کے لوگ عربوں کی نیاز مندی کریں گے تو وہ ان کے مورد فضل وکرم ہوں گے۔

(چچ نامہ،ص:۲۱۰-۱۱)

چناں چہ کاشتکار وغیرہ خود محمد بن قاسم کے پاس آئے اور خراج دینا قبول کرلیا، اس کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن عمال کو ہدایت دی کہ سلطان اور رعایا کے درمیان پوری سچائی سے معاملات طے کیے جائیں گے، اگر تقسیم کا معاملہ ہو تو دونوں میں نصفا نصف طے کیا جائے، خراج اتنا مقرر کیا جائے، کہ یہ ادا ہو سکے، خراج دینے والوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے؛ تاکہ ملک خراب نہ ہونے پائے۔ (چچ نامہ،ص:۲۱۱)

عام لوگوں کے ساتھ نرمی

یہ تو برہمن عمال کو ہدایت دی گئی ، پھر محمد بن قاسمؒ نے تمام لوگوں کو علاحدہ بلا کر ان سے کہا کہ تم ہر طرح خوش رہنے کی کوشش کرو، کسی بات کا اندیشہ نہ لاؤ، تم سے کوئی مواخذہ نہ کیا جائے گا، میں تم سے خراج کے لیے کوئی دستاویز یا قبالہ نہیں لکھاتا ہوں، جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے اس کو ادا کرتے رہو، وصولی میں بھی تمہارے ساتھ نرمی اور رعایت کی جائے گی، تمہاری ہر درخواست کی شنوائی ہوگی ،شافی جواب پاؤ گے، اور تمہاری ہر مراد پوری ہوتی رہے گی۔ (چچ نامہ، ص:۲۱۲)

مندر میں عبادت کی عام اجازت

برہمن آباد میں ایک بہت بڑا مندر تھا، لڑائی کے زمانے میں یہاں کے لوگوں کا آنا جانا بند ہو گیا تھا، فتح کے بعد بھی لوگ خوف کی وجہ سے یہاں نہیں آتے جاتے تھے، جس سے اس کی آمدنی ختم ہو گئی تھی، مندر کے برہمن اور مہنت فاقہ کرنے لگے، ایک روز وہ ''محمد بن قاسمؒ'' کے دروازے پر آئے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا:

اے امیر عادل! آپ کو بقا حاصل ہو، ہم مندر کے پجاری ہیں، ہم کو اسی مندر سے روزی ملتی ہے، آپ نے سب پر رحم کیا ہے، سوداگروں کو مال دلوایا، تاجروں کی تجارت کھلوادی، اوروں کو ذمی بنا کر اپنے کاموں میں لگا دیا، ہم کو کرم خداوندی سے امید ہے کہ آپ ہندوؤں کو حکم دیں گے، کہ وہ مندر میں آ کر اپنے معبود کی پرستش کریں، محمد بن قاسمؒ نے جواب دیا کہ تمہارا مندر ''ارور'' کے دارالسلطنت سے متعلق ہے، اس پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا ہے، ہندوؤں نے عرض کیا کہ یہ مندر برہمنوں سے متعلق ہے، یہ ہمارے پنڈت اور پروہت ہیں، ہمارے یہاں شادی اور غمی میں وہی رسمیں ادا کرتے ہیں، ہم نے خراج دینا اسی لیے قبول کر لیا ہے کہ ہم میں ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت

ہوگی، ہمارا مندر خراب ہو رہا ہے، ہم وہاں جا کر پوجا کرنے سے محروم ہیں، آپ اس کی مرمت کرادیں؛ تا کہ ہم وہاں جا کر پوجا کریں، اور ہمارے برہمنوں کی وجہ معاش ہو، محمد بن قاسمؒ نے یہ ساری باتیں حجاج کو لکھ کر بھیجیں، وہاں سے جواب آیا کہ:

''حالات معلوم ہوئے، اگر برہمن آباد کے مقدم اپنا مندر بنانا چاہتے ہیں تو اب جب کہ انہوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے اور دارالخلافت میں مال کے ادا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے تو اس مال کے علاوہ ان پر ہمارا کوئی اور حق نہیں، جب وہ ذمی ہو گئے ہیں تو ان کے جان و مال میں کسی طرح کا تصرف صحیح نہیں، ان کو اجازت دی جائے، کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں، مذہب کی پیروی میں کسی شخص پر زجر نہ کیا جائے تا کہ وہ اپنے گھر میں جس طرح چاہے رہے''۔ (سلاطین ہند اول، ص:۳۱)

تعمیر مندر کی اجازت اور پرانے مراسم کا تحفظ

حجاج کے اس فرمان کے بعد محمد بن قاسمؒ نے برہمن آباد کے اہم لوگوں، مقدموں اور برہمنوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اپنے مندر کی تعمیر کرائیں، مسلمانوں کے ساتھ خرید و فروخت کریں، بے خوف و خطر رہیں، اپنے حال کو بہتر بنانے میں کوشاں رہیں، بھکاری برہمن کے ساتھ اچھا سلوک کریں، اپنے باپ دادا کے مراسم کو بجا لائیں، برہمنوں کو صدقے یعنی دَکھشِنا دیے جاتے تھے، وہ اب بھی دیے جائیں، مال گذاری کے سو (۱۰۰) درہم میں تین درہم برہمنوں کے لیے علاحدہ کر دئے جاتے تھے؛ تا کہ ضرورت کے وقت ان کی مدد ہوتی رہے، اور بقیہ رقم خزانے میں داخل کر دی جاتی تھی؛ تا کہ اس میں خیانت نہ ہو، یہ روایت باقی رکھی جائے، امرا جو مواہب (عطیات) برہمنوں کو دیا کرتے تھے، وہ پہلے کی طرح دیا کریں، برہمنوں کو اس کی بھی اجازت دی گئی، کہ وہ بدستور سابق ایک تانبے کا برتن لے کر گھر گھر جائیں، غلہ مانگا کریں تا کہ وہ بھوکے نہ مریں۔ محمد بن قاسمؒ نے برہمنوں کی تمام

باتوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ ان کے مندر ایسے ہی ہیں کہ جیسے شام اور عراق کے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور مجوسیوں کے آتش کدے ہیں، ان کو اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں عبادت کریں، محمد بن قاسمؒ نے برہمن آباد کے مقدموں کو ''رانا'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (چچ نامہ، ص:۲۱۴۔۲۱۳)

ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں کسی حکومت کے مقبول ہونے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس کے باشندوں کو مذہبی فرائض انجام دینے اور عبادت کرنے میں آزادی ہو، ہندوستان کے مسلم حملہ آوروں نے مذہبی رواداری کی اہمیت کو بہت جلد محسوس کرلیا تھا، اور اپنی حکمت عملی اسی کے مطابق بنائی، آٹھویں صدی میں محمد بن قاسمؒ نے سندھ میں اپنی حکومت کا جو نظم ونسق قائم کیا وہ اعتدال اور رواداری کی روشن مثال ہے''۔ (ہسٹری آف جہانگیر، ص:۸۹۔۸۸)

غیاث الدین بلبن کے عہد کی رواداری

غیاث الدین بلبن (حکومت: ۱۲۸۷ء۔۱۲۶۵ء) کے دور کی رعایا پروری، عدل گستری اور رواداری کا اندازہ سنسکرت کے اس کتبے سے بھی ہوتا ہے، جو پالم میں پایا گیا اور دہلی کے آثار قدیمہ کی عجائب گاہ میں موجود ہے، اس میں تاریخ ۱۳۳۷ بکرمی، مطابق ۸۱۔۱۲۸۰ء درج ہے، اس میں سلطان غیاث الدین بلبن کے متعلق ہے کہ اس بادشاہ کی حکومت شاندار اور قابل تعریف ہے...... اس بادشاہ کی خدمت میں جو متعدد راج آتے جاتے ہیں ان کے مکٹوں سے گرے ہوئے جواہرات کی چمک دمک کھل جانے سے سارا ملک جگمگا رہا ہے...... جب سے اس سلطان دنیا نے دنیا کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا ہے دنیا کو سہارا دینے والے شیش ناگ دھرتی کے بوجھ سے سبک دوش ہو بیٹھے ہیں اور وشنو بھگوان ان کی نگہبانی کا خیال چھوڑ کر اطمینان سے

دودھ کے سمندر پر محو استراحت ہیں...... اس سلطان کے عہد معدلت میں...... دہلی کا شہر خوش حال اور فارغ البال ہے، یہ شہر دھرتی ماتا کی طرح بے شمار جواہرات کا خزانہ ہے، شورگ دھام کی طرح عیش وعشرت کا ٹھکانہ ہے، پاتال کے مانند شہزوردلتوں کا مسکن ہیں اور مایا کی طرح دل کش ودل فریب ہے۔ (ہندوستان کے معاشرتی حالات از منہ بروسطیٰ میں از عبداللہ یوسف علی، ص:۱۰۰۔۹۸)

ہندو راجاؤں کا احترام

اوپر کے کتبے سے ظاہر ہے کہ بلبن کے دربار کی زینت وآرائش بڑھانے میں ہندو راجاؤں کا بھی حصہ تھا، سلاطین دہلی کے زمانے میں ہندو امرا دربار سے علاحدہ رہنے کے بجائے اس سے برابر وابستہ رہے؛ مگر اس عہد کے مورخوں نے ان کا ذکر اس انداز میں نہیں کیا ہے، جس طرح کہ ان کا مغلوں کے زمانے میں ہوا۔ (مذہبی رواداری، ج:۱، ص:۸۰)

محمود غزنوی کی رواداری

سلطان محمود بن سَبکتگین غزنوی (حکومت: ۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء) کا ہندوؤں کو اپنی طرف مائل کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں، کیونکہ نہ صرف اس کے غزنہ اور پنجاب کے علاقے میں ہندو آباد تھے، بلکہ اس کی فوج میں ہندو سردار اور لشکری بھی تھے، وہ ''طخرستان'' سے بڑھ کر ''بلخ'' ایک خاں سے برسرپیکار ہونے کے لیے گیا، تو اس کے لشکر میں ترکوں، خلجیوں اور غزنیوں کے ساتھ ہندو لشکر بھی تھے۔ (تاریخ یمینی بحوالہ الیٹ جلد دوم، ص:۳۲)

موجودہ دور کے بعض وسیع النظر اور فراخ دل ہندو مورخوں نے ہندوؤں کے ساتھ سلطان محمود غزنوی کی رواداری کا اعتراف اچھی طرح کیا ہے، مثلاً ایشورٹوپا

نے لکھا ہے کہ موجودہ دور کے ایک مورخ کا خیال ہے، جو محمود غزنوی کا ناقد بھی ہے کہ وہ کوئی مبلغِ اسلام نہیں تھا، غیر مسلموں کو مسلمان بنانا اس کا مقصد نہیں رہا، الفنسٹن نے ہم کو یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطان گجرات میں عرصۂ دراز تک رہا، لاہور میں بھی اس کا قیام رہا؛ لیکن اس نے کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر ہی نہیں کی، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا، اس نے کسی بھی شخص کو اس کے ذاتی ضمیر کی بنا پر موت کی سزا نہیں دی۔ (پالی ٹیکس ارنی پری، پری مغل ٹائمس، ڈاکٹر ایشور ۴۶، ۴۵)

شہاب الدین غوری کی رواداری

غزنویوں کے بعد ہندوستان میں غوری آئے، شہاب الدین محمد غوری (حکومت: ۱۲۰۲ء تا ۱۲۰۶ء) کی تلوار ملتان، انہلواڑہ، سیالکوٹ، بھٹنڈا، اور ترائین وغیرہ میں ضرور چمکی، لیکن اس کے واقعاتِ زندگی میں یہ واقعہ بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ جب ''نہروالا'' یعنی انہلواڑہ کی فتح میں ناکام رہ کر غزنہ میں مقیم تھا اور اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا، کسی نے عرضی لکھ کر بھیجی کہ نہروالا میں ایک مشہور سوداگر ہے جس کا نام ''دسالہ ایہر'' ہے، وہ ہمیشہ لاکھوں کا مال تجارت کی غرض سے ان علاقوں میں بھجوایا کرتا ہے، چناں چہ اس وقت بھی اس کا دس لاکھ کے قریب کا مال غزنیں میں آیا پڑا ہے، اگر بادشاہ سلامت چاہیں تو اس مال کو ضبط کر کے خزانے میں بھجوایا جاسکتا ہے، اس سے نہ صرف خزانہ معمور ہوگا؛ بلکہ شاہی شان و شوکت میں اضافہ ہوگا، سلطان نے عرضی کی پشت پر لکھ دیا کہ:

''دسالہ ایہر کا یہ مال اگر نہروالا میں ہوتا اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا، تو ہمارے لیے حلال ہوتا، لیکن غزنیں میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لیے حرام

ہے؛ کیونکہ وہ میری پناہ میں ہے، (جوامع الحکایات ولوامع الروایات اردو ترجمہ نسخہ دارالمصنفین ورق: ۹۴، اردو ترجمہ حصہ اول ص: ۴۷) (مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج: ۱ ص: ۷۲)

علاء الدین خلجی کے عہد میں ہندو راجاؤں کی قدر و منزلت

سلطان علاء الدین خلجی (۱۳۱۶ء-۱۲۹۶ء) نے جب جنوبی ہند کی تسخیر کی تو ان علاقوں کی فتوحات کے سلسلے میں ہندو راجاؤں کا بھی تعاون رہا، علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۶ء میں دیوگیر فتح کیا، اس کا راجہ رام دیو علاء الدین خلجی کا ہر طرح وفادار رہا، اس کے لڑکے بھیم نے اس کے خلاف سرکشی کی، تو اس نے علاء الدین خلجی سے امداد طلب کی۔

ملک کافور کی نگرانی میں یہ فوج دیوگیر کی طرف بھیجی گئی اور وہاں اس کو فتح حاصل ہوئی، عصامی کا بیان ہے کہ اس کے بعد رام دیو علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا، اس پر موتی نچھاور کیے گئے، دولاکھ تنکے نذر دیے گئے، رائے رایان کا خطاب عطا کیا گیا اور کچھ دنوں کے بعد اس کو چتر بھی دیا گیا۔ (رواداری، ج: ۱ ص: ۸۱)

اور جب ۱۳۰۹ء میں دہلی سے کافور کی فوج ''ارنگل'' کی طرف بڑھی تو رام دیو نے شاہی فوج کی ہر طرح مدد کی، یہ فوج دیوگیر ہوتی ہوئی ''ارنگل'' پہنچی تو رام دیو نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا، ملک کافور اور اس کے امرا کی خدمت طرح طرح سے کی، روزانہ لشکر کی دیکھ بھال کے لیے آتا، اس کے لیے علوفے فراہم کیے، دیوگیر کا بازار کھول دیا، دکانداروں کو، تاکید کی کہ وہ اپنی چیزوں کو سستی قیمت پر فروخت کریں، جب لشکر دیوگیر سے آگے بڑھا تو رام دیو نے اپنے آدمی ارنگل تک ساتھ کر دیے کہ وہ لشکر کو علوفہ، غلہ اور دوسری چیزیں فراہم کرتے رہیں، اور لشکر کا پورا

تعاون کریں، اس نے ملک کافور کے سایہ بان ''لعل'' کی محافظت کے لیے مرہٹہ سوار اور پیادے بھی نامزد کیے، خود ملک کافور کو رخصت کرنے دور تک گیا۔ (مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ج:۱ص:۸۲۔۸۱)

ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی توقیر

کے، ایم پنیکر نے اپنی کتاب ''اے سروے آف انڈیا'' میں لکھا ہے کہ:

''علاء الدین خلجی......ایک متعصب حکمراں سمجھا جاتا ہے، لیکن اس نے ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت اور توقیر کی، جینیوں کے ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین خلجی نے آچاریہ مہاسین کو کرناٹک سے اپنے دربار میں مدعو کیا، اس سے مذہبی مناظرے کیے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرقہ ''دیگمبر'' کے پیشوا پورنا چندر جو دہلی میں رہتے تھے درسوئمبر یوگی رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان کے یہاں بہت تھی''۔

شیر شاہ سوری کا عدل وانصاف

فرید خاں شیر شاہ سوری (حکومت: ۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) کا بیٹا عادل خاں ایک دفعہ ہاتھی پر سوار ہو کر آگرہ میں کسی کوچے سے گزرا، ایک ہندو کی بیوی اپنے مکان کے صحن میں برہنہ نہا رہی تھی، جب شہزادہ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے پان کا بیڑا لے کر اس کی طرف پھینکا اور گھورتا ہوا چلا گیا، عورت صاحبِ عصمت تھی، اس کو شہزادہ کی اس حرکت سے بہت صدمہ پہنچا اور خاوند سے ذکر کیا، خاوند نے دادفریاد کے لیے دوڑ دھوپ کی؛ لیکن شہزادہ کے مقابلے میں کسی نے کچھ نہ سنا، آخر اُس نے جرأت کی اور بادشاہ کے انصاف پر بھروسہ کرکے اس سے حقیقت حال عرض کی، بادشاہ نے معذرت کی اور کہا کہ یہ بقّال ہاتھی پر سوار ہو اور عادل خاں کی بیگم برہنہ

اس کے سامنے آئے اور مستغیث اس پر پان کا بیڑا پھینکے، امرا اور وزرا نے عرض کیا کہ شاہزادے کا قصور معاف ہو، اس پر بادشاہ نے کہا کہ میری عدالت میں فرزند اور رعیّت برابر ہیں، معافی دینا نہ دینا بقّال کے اختیار میں ہے، آخر شہزادے نے بقّال سے معافی مانگی اور اس کی معذرت قبول کرنے پر شہزادے کی خلاصی ہوئی۔ (تاریخ شیر شاہی از عباس خاں شیروانی: ۳۲۔۱۳۳)

برہمن کے ساتھ حسن سلوک

ایک مرتبہ شیر شاہ کشتی پر سوار ہو کر آگرے سے ''کالنجر'' جارہا تھا، راستے میں ''کالپی'' پڑا، کالپی کے علاقے ''حمیر پور'' کا ایک برہمن ایک جگہ غسل کررہا تھا، ملّاح کشتی کو تیزی سے آگے بڑھا رہا تھا؛ لیکن شیر شاہ نے اس جگہ کشتی کو روکا، جہاں برہمن غسل کررہا تھا، اور اس سے علاقے کی جاگیردار کی امارت وعدالت کے رنگ ڈھنگ کے بارے میں پوچھا، برہمن کو معلوم نہ تھا کہ وہ بادشاہ سے باتیں کررہا ہے، اس لیے پرگنہ کے متعلق جو سچ سچ باتیں تھیں ان کو مختصر طریقے پر بتا کر اپنے گھر کی راہ لی، وہ جاچکا تو شیر شاہ نے اپنے مقربوں سے کہا کہ برہمن کو تو اس وقت یہ معلوم نہ ہوسکا، کہ وہ بادشاہِ وقت سے ہم زبان ہوا ہے؛ لیکن ظن غالب یہ ہے کہ اس کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ بادشاہ سے ہم کلام ہوا ہے، اس وقت یہ محسوس کرے گا کہ اس کی ہم زبانی سے دوسروں کے مقابلے میں اس کو کیا فائدہ ہوا، شیر شاہ نے اس برہمن کو واپس بلایا اور جو گاؤں برہمن کا تھا وہ اس کو انعام میں بخش دیا، اور اس کے دامن میں پانچ سو روپے نقد دے کر اس کو رخصت کیا۔ (تاریخ داؤدی، ص: ۳۹۔۱۳۸)

شیر شاہ (وفات: ۱۵۴۵ء) نے اپنی رواداری اور فراخ دلی کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا، اس سے ہندو مسلمان دونوں خوش رہے، اس کی فوج میں پیدل سپاہی اور بندوقچی تمام تر ہندو تھے۔ اس کے بہترین سپہ سالاروں میں ''پریم جیت گوڑ''

تھا، گوالیار کا راجہ رام ساہ، شیر شاہ کی حمایت میں لڑتا رہا۔

ڈاکٹر کالکا رنجن قانون گو شیر شاہ کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شیر شاہ نے مذہب اور سیاست میں ایسا خوش گوار امتزاج پیدا کر دیا تھا، جس سے ہندوستانی قومیت کو ترقی کرنے کے لیے نہایت مناسب فضا مل گئی۔ مسٹر ''ڈبلیو کروک'' کی اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ شیر شاہ پہلا حکمراں ہے، جس نے عوام کی مرضی کے مطابق ایک ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی، اس نے نہ کسی مندر کو منہدم کیا اور نہ کسی بت کو توڑا، اس کی مذہبی پالیسی میں صرف رواداری ہی نہ تھی، بلکہ غیر جانب داری بھی تھی۔ شیر شاہ نے ہندو مذہب کا احترام ہر چیز میں ملحوظ رکھا، ہندوؤں کے لیے ہر سرائے میں علاحدہ انتظام تھا، شیر شاہ نے حکومت میں سیکولر اسپرٹ پیدا کی......وہ پہلا حکمراں ہے، جس نے مختلف مذاہب کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنانے کی کوشش کی، شیر شاہ صحیح معنوں میں ایک مدبر تھا، اس نے ایک ایسا جان دار اور عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جس سے ہندوؤں میں سیاسی اور اقتصادی خوش حالی خود بہ خود پیدا ہو گئی، اس نے ہندو مسلمانوں کو متحد رہنے پر آمادہ کیا''۔

(شیر شاہ، ص:۴۱۰، ۴۱۶)

سوری خان دان کی مذہبی رواداری اپنی انتہا کو اس وقت پہنچ گئی، جب ھمو بقال وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوا، وہ قصبہ ریواری کا رہنے والا ہندو بقال تھا، اسلام شاہ کے عہد میں وہ محض ایک دوکان دار تھا، پھر توشہ خانے کا نگراں ہو گیا، اس کے بعد بازار کا کوتوال بنایا گیا، عادل شاہ کے عہد میں وہ ترقی کر کے وزارت عظمیٰ تک پہنچ گیا، اپنی ہوش مندی سے اپنے شاہی آقا پر اتنا غالب ہو گیا، کہ وہی بااختیار بنا رہا، جس امیر کو جہاں چاہتا بھیج دیتا، اس کی جاگیر اپنی مرضی سے واپس لے لیتا، اپنے غیر معمولی دفاع سے اپنے شاہی آقا کے لیے بائیس لڑائیوں میں فتح پائی۔

سلطان محمد تغلق کا عدل وانصاف

ابن بطوطہ (وفات: ۱۳۷۸ء) نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے، کہ محمد تغلق (حکومت: ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) کے خلاف ایک ہندو امیر نے دعویٰ کیا کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلاسبب مار ڈالا ہے، قاضی نے سلطان کو اپنی عدالت میں طلب کیا، وہ بغیر کسی پندار کے قاضی کی عدالت میں گیا، اور وہاں جا کر سلام و تعظیم کی، قاضی کو پہلے کہلا بھیجا تھا کہ وہ عدالت میں آئے تو اس کی تعظیم نہ کی جائے، وہ قاضی کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہوا، قاضی نے حکم دیا کہ سلطان مدعی کو راضی کرے ورنہ قصاص کا حکم ہوگا، سلطان نے مدعی کو راضی کیا تو اس کی گلوخلاصی ہوئی۔ (سفر نامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ، ص:۱۳۷۔۳۸)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی اور سلطان دونوں اس ہندو امیر کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرنے کے بجائے منصفانہ برتاؤ کرنے پر مجبور تھے اور یہ تو تاریخوں سے کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں عدل وانصاف کرنے میں ہندو مسلمانوں کی تفریق کی جاتی تھی، جیسے جیسے نئی تحقیقات سامنے آ رہی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین دہلی کے عہد میں بھی ہندو ذمہ دار عہدوں پر مامور ہوتے رہے۔

سلطان محمد تغلق کے دور میں ہندو عہدے دار

سلطان محمد تغلق کے عہد میں تو نظامِ سلطنت چلانے میں بہت سے ہندو شریک کیے گئے، چنار کے ایک کتبے سے معلوم ہوا کہ اس سلطان کا ایک ہندو وزیر سائے ''راج'' تھا، خود ضیاء الدین برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے دیوگیر کا وزیر عماد الملک کو بنایا تو اس کا نائب وزیر دھارا کو مقرر کیا۔ (ابن بطوطہ، ص:۵۰۱)

برنی ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیرا مالی کو دیوان وزارت کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ (ابن بطوطہ، ص:۵۰۵)

سیروان کا حاکم ''رتن'' بنایا گیا، بھیران رائے گلبرگہ کا مقطع مامور ہوا، اور اس کو ''کوہیر'' کا اقطاع دیا گیا، ابن بطوطہ اور عصامی دونوں کا بیان ہے کہ وہ جوگیوں سے بحث ومباحثہ کیا کرتا تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے (A Comprehensive history of India) شائع کردہ انڈین ہسٹری کانگریس میں لکھا ہے کہ جینیوں کے ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان جینی فضلا سے تعلق رکھتا تھا، ان میں سے ایک جینا پر بھاسوری نے اس سے آدھی رات تک مذہبی گفتگو کی، جس کے بعد سلطان نے اس کو ایک ہزار گائیں اور دوسرے تحفوں کے ساتھ دیں، سلطان نے اور دوسرے جین فضلا میں، راجہ سیکھارا اور جینا پر بھاسوری کی بھی سرپرستی کی، سلطان ہندوؤں کے تہوار ہولی سے بھی دل چسپی لیتا رہا۔ (مذہبی رواداری، ج:۱ ص:۸۸)

ترکی حکمراں سلیمان اعظم قانونیؒ کی رواداری

قانونِ رعایا

سلیمان اعظم قانونی (حکومت: ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے جو قوانین وضع کیے تھے وہ اس کی رواداری، روشن خیالی اور تدبر کی ایک نمایاں مثال ہے، اس نے لگان اور دیگر خدمات جو رعایا پر جاگیر دار کی طرف سے عائد ہوتی تھی تصریح کے ساتھ قانونِ رعایا میں درج کرا دیا؛ تاکہ جاگیر دار اپنے حق سے زیادہ مطالبہ نہ کر سکے ''قانونِ رعایا'' کے رو سے مزروعہ زمین کی ملکیت کاشت کار کو حاصل ہوتی تھی اور اس کے معاوضے میں اسے لگان اور بعض محصول ادا کرنے ہوتے تھے اور اپنے جاگیر دار کے لیے چند متعین خدمات انجام دینی ہوتی تھیں، سلطنت عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور مسیحی یورپ کے زرعی غلاموں (Serfs) کی حالتوں کے فرق کا اندازہ اس امر سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک

کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنتِ عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور وتعدی پر ترکوں کی نرم حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔ کریسی سلیمان کے ایک ہم عصر مسلمان کے ایک ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے:

''میں نے گروہ در گروہ ہنگروی دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنی بیوی، بچوں، مویشی اور سامانِ کاشت کو لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے جہاں وہ جانتے تھے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہ کیا جائے گا''۔ (دولت عثمانیہ، حصہ اول، ص:۲۲۱)

ترکی خلیفہ سلیمان ثانی کے دور میں رواداری

عیسائی رعایا کے ساتھ مخصوص رعایتیں

خلافتِ عثمانیہ کے سربراہ سلیمان ثانی (حکومت: ۱۶۸۷ء تا ۱۶۹۱ء) نے مصطفیٰ پاشا کوپریلی کو صدرِ اعظم مقرر کیا، ان کو تمام رعایا کی فلاح وبہبود کا بے حد خیال تھا اور وہ سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کرتا تھا، اس کی عدالت میں مذہب وملت اور رنگ ونسل کی کوئی تمیز نہ تھی، اس عموم میں سلطنت کے عیسائی رعایا کو ایک خاص خصوصیت حاصل تھی، مصطفیٰ پاشا ان کے ساتھ خاص رعایتیں کرتا تھا، وہ دیکھتا تھا کہ جو مسیحی حکومتیں ترکی پر حملہ آور ہو رہی ہیں انہیں دولت عثمانیہ کی عیسائی رعایا سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے، چناں چہ ''البانیا'' کے عیسائی رعایا ''وینس'' کی فوجوں میں شامل ہو رہی تھی اور سرویا کے باشندے شہنشاہِ آسٹریا کی مدد کے لیے تیار تھے، یونان میں موروسینی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی، کہ وہاں کے عیسائیوں نے حملہ آوروں کا استقبال کیا، اور اُن کے لیے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں، ان واقعات کو دیکھ کر مصطفیٰ پاشا نے عیسائیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی، چناں چہ اس نے اپنے

تقرر کے بعد فوراً ہی تمام پاشاؤں کے نام احکام جاری کیے کہ عیسائی رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے اور ان کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے، ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس نے سخت سزائیں دینا شروع کیں، عیسائی رعایا پر مختلف محصول عائد تھے، اس نے جزیہ کے علاوہ اور تمام محصول معاف کر دیے، پہلے عیسائی رعایا کو صرف اپنے قدیم کنیسوں کی مرمت کا حق حاصل تھا، وہ کوئی نیا کنیسہ تعمیر نہیں کر سکتے تھے، مصطفیٰ پاشا نے یہ پابندی اٹھا دی اور انہیں جدید کنیسوں کی تعمیر کا حق بھی دے دیا، چناں چہ اس کے دورِ وزارت میں بہت سے نئے کنیسے تعمیر کیے گئے، ان تمام رعایتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی رعایا میں دولتِ علیہ کے ساتھ ایک عام ہمدردی پیدا ہوگئی، خصوصاً ان عیسائیوں میں جو کلیسائے یونان کے پیرو تھے، کیوں کہ مغرب کی عیسائی حکومتیں جو کلیسائے روما کی متبع تھیں ان پر قابو پانے کے بعد نہایت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھیں اور انہیں بہ جبر اپنے مذہب کا پیرو بنانا چاہتی تھیں۔ (دولت عثمانیہ، حصہ اول، ص: ۳۱۰-۳۱۱)

شاہانِ مغلیہ کی رواداری

ظہیر الدین بابر کی رواداری

مغلیہ دورِ حکومت میں سیاسی اور مذہبی رواداری کا نیا باب کھل گیا، ظہیر الدین بابر (حکومت: ۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء) کی فراخ دلی، رحم وکرم، ہمدردی وفیاضی اور مساوات ورواداری کے معترف صرف مسلمان ہی نہیں؛ بلکہ موجودہ دور کے ہندو مورخین بھی ہیں، بابر کی حسب ذیل وصیت سے اس کی سیاسی بصیرت اور انسانی ہمدردی اور مذہبی رواداری کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو اس نے اپنے شہزادے ہمایوں کو کی تھی:

"اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے، کہ اس نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی ہے، تم پر لازم ہے کہ تم اپنے لوح

سے تمام مذہبی تعصّبات کو مٹا دو اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسان سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل وانصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلافات کو نظر انداز کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والے رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملنے دو، جس طرح انسانی جسم ملا رہتا ہے، تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، تزک تیموری کا برابر مطالعہ کرتے رہو؛ تاکہ سلطنت کے نظم ونسق کا تجربہ ہو"۔ (جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ)

سلطنت مغلیہ کے بانی فرماں روا کی یہ وصیت ڈاکٹر راجندر پرشاد (پہلے صدر جمہوریۂ ہند) کی کتاب India divided (تقسیم ہند) میں بھی موجود ہے، بعد کے تمام شاہانِ مغلیہ نے اس وصیت کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائے رکھا اور اپنے اپنے دور میں چمنستان ہند کو الفت ومحبت، اتحاد ویگانگت، خیر خواہی وہمدردی اور مساوات ورواداری سے جنت نظیر بنا دیا۔

بابر کی فوج کوچ کرتی تو اس کی کوشش ہوتی کہ جو علاقے اس کے تصرف میں آ چکے ہیں وہاں کے لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر وہ کوئی ظلم وستم کرتی تو اس کی پوری سزا دیتا تھا، مثلاً ۹۳۵ھ میں اس کی فوج بھیرہ میں داخل ہوئی تو وہ لکھتا ہے کہ:

"لوگوں نے عرض کی کہ کچھ سپاہیوں نے بھیرہ والوں کو ستایا ہے اور ان پر ہاتھ ڈالا ہے، فوراً ان سپاہیوں کو گرفتار کر کے بعض کو سزائے موت کا حکم دیا اور بعض کی ناکیں کٹوا کر تشہیر کرایا، اس ملک کو تو ہم اپنا ہی جانتے تھے اسی وجہ سے اس کو بالکل محفوظ و مامون رکھا۔" (تزک بابری، اردو ترجمہ، ص: ۲۲۷)

ہمایوں کی رواداری۔

نصیرالدین ہمایوں (حکومت بارِ اول: ۱۵۳۰ تا ۱۵۴۰ء۔ بارِ دوم ۱۵۵۵ء تا ۱۵۵۶ء) کے بارے میں ڈاکٹر ایس کے بنرجی نے اپنی کتاب ''ھمایوں بادشاہ'' میں لکھا ہے، کہ وہ سنی اور امام اعظم کے مسلک کا پیرو تھا؛ لیکن دوسرے عقائد والوں کے امرار ہے؛ اس لیے وہ شیعیت کی طرف مائل ہوگیا تھا بابر اس کو وصیت کی تھی، کہ وہ ذبیحہ گاؤ بند کرادے اور مندروں کا انہدام نہ کرے، اس نصیحت نے اس کو اعتدال پسند بنا دیا تھا، اس لیے وہ عام ہندوؤں اور راجپوتوں کی ریاستوں سے اچھے تعلقات رکھتا تھا، اس کو ''چوسا'' میں شکست ہوئی تو واپسی کے وقت ایک ہندو راجہ ''بیر بھن'' نے اس کی مدد کی، امرکوٹ کی راجپوت ریاست ہی میں اکبر کی پیدائش ہوئی (ہمایوں بادشاہ، ۳۵۶، ۳۵۴)

ہمایوں کے عہد میں مسلمان اہل علم روز بہ روز ہندوؤں کے علوم وفنون کی طرف بھی مائل ہوتے جارہے تھے، چناں چہ تاج الدین مفتی المالیک نے سنسکرت کی مشہور کتاب ''ہتولاش'' کا ترجمہ فارسی میں مفرح القلوب کے نام سے کیا اور ہمایوں ہی کے نام سے معنون کیا۔ (فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری، ۱۱۰۳)

محمد گوالیاری نے سنسکرت کی مشہور تصنیف ''امرت کنڈ'' کا ترجمہ فارسی میں ''بحرالحیات'' کے نام سے کیا ہے۔ (فہرست مخطوطات، فارسی، برٹش میوزیم، ج: ۱۵۹/۱، بہ حوالہ مذہبی رواداری جلد دوم، ص: ۷)

اکبر کی رواداری

جلال الدین اکبر (حکومت: ۱۶۰۵ء ۱۵۵۶ء) نے غلو کی حد تک رواداری کا مظاہرہ کیا اور اسلامی تعلیمات کی رو سے اس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، کہ

دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ رواداری اس حد تک کی جائے کہ ان مذہبی اور معاشرتی رسوم ورواج کو اختیار کرلیا جائے اور اپنی مذہبی تعلیمات وافکار کو خیرآباد کہہ دیا جائے جیسا کہ اکبر نے کیا نہ شرعاً ہی اس کی گنجائش ہے اور نہ ہی یہ رواداری کا تقاضا ہے، لیکن اس کی اس درجہ رواداری سے اس دور بڑی میں خوش گوار قومی فضا قائم ہوگئی تھی۔

اکبر نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں راجپوتوں کے دلوں کی تسخیر کے لیے تمام ممکن ذرائع اختیار کیے، ان سے شادی بیاہ کرکے رشتے بھی قائم کیے، اس کا نکاح نبیر کے ''کچھواہہ'' خاندان کے راجہ بہارامل کی لڑکی یعنی راجہ بھگوان داس کی بہن سے بھی ہوا، اس کے بطن سے شہزادہ سلیم پیدا ہوا جو آگے چل کر نورالدین جہاں گیر کے لقب سے اس کا جانشین ہوا، اکبر نے شہزادہ سلیم کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی مان بائی سے کی، اکبر نامہ جلد سوم، ص: ۵۲۔۱۵۲ میں اس شادی کی پوری تفصیل موجود ہے۔

جہاں گیر نے خود اکبر کی رواداری کے متعلق لکھا ہے:

''مختلف مذاہب اور قوموں کے لوگوں کے لیے ان کی بے نظیر اور وسیع سلطنت میں دنیا کی دوسری سلطنتوں کے برخلاف شیعوں کو سوائے ایران کے اور سنیوں کو سوائے روم کے، ہندوستان اور توران کے کسی اور جگہ رہنے اور بسنے کی وہ تمام سہولتیں میسر نہیں، جس طرح کہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کے وسیع دائرے میں تمام اقوام اور اہل مذاہب کے لیے جگہ ہے اور یہ دیکھتے ہوئے، کہ بادشاہ کا سایہ پرتو ذاتِ الٰہی ہوتا ہے، اپنے ممالک محروسہ میں جس کی حدیں دریائے شور کے کناروں تک ختم ہوتی ہیں، تمام اہل مذاہب اور مختلف عقیدوں کے لوگوں کو، خواہ ان کے عقیدے صحیح ہوں یا ناقص رہنے بسنے کے لیے جگہ دے کر ایک دوسرے پر نکتہ چینی کی راہ کو بھی بند کر دیا تھا، سنی شیعہ کے ساتھ ایک مسجد

میں اور یہودی عیسائی کے ساتھ ایک کلیسا میں اپنے اپنے طریقہ پر عبادت کرتے تھے، ان کا مسلک صلح کل تھا، ہر دین ومذہب کے اچھے لوگوں کے ساتھ مجالست کیا کرتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ اس کی فہم واستعداد کے مطابق التفات فرماتے تھے، ان کی راتیں بیداری میں گذرتی تھیں اور دن میں بہت کم سوتے تھے، ان کا سونا دن اور رات میں ایک یا ڈیڑھ پہر سے زیادہ نہیں ہوتا تھا''۔ (تزک جہانگیری، ص:۱، نیز اردو ترجمہ اعجاز الحق قدوسی، ص:۸۶۔۸۵)

اکبر کے دور میں مختلف قوموں کے باہمی تعلقات بڑے خوش گوار تھے، اکبر نے بڑی فراخ دلی اور رواداری کا معاملہ کیا، لیکن یہ رواداری اسلامی احکام ومسائل کی بہت کچھ قربانی کے بعد حاصل کی گئی تھی، اس نے ہندو راجپوتوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے خود ہندو عورتوں سے شادی کی اور جہاں گیر کا نکاح بھی جودھ پور کی راجہ کی پوتی سے کرایا اور ہندوؤں کو بڑے بڑے منصب اور اعلی عہدے تفویض کیے، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصر شاہی میں ہندو تہذیب وتمدن کے اثرات غالب ہوتے گئے اور بادشاہ کے مذہبی شادی محل میں ہندوانہ رسوم علانیہ اور کھلم کھلا ہورہی تھیں، ہندوؤں کے لیے مندر بنائے جارہے تھے، بادشاہ نے انہیں خوش کرنے کے لیے ملک میں گاؤکشی ممنوع قرار دے دی، ہندوؤں کو جزیہ سے معاف کردیا گیا، پھر بادشاہ کبھی آفتاب اور آگ کے سامنے سرِ عقیدت خم کرنے لگتا ہے اور کبھی ستاروں اور حضرت مریم کو بھی لائق پرستش سمجھنے لگتا ہے۔ ؎

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر[1] مجھے گبر مسلماں مجھ کو

(مسلمانوں کا عروج وزوال، ص:۶۰۳)

[1] گبر: آتش پرست

جہاں گیر کی مذہبی فراخ دلی ورواداری

نورالدین جہاں گیر (حکومت: ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) کی فراخ دلی اور رواداری کی تعریف مسلمان اور ہندو دونوں مورخین نے کی ہے، مثلاً مولانا شبلیؒ رقم طراز ہیں:

''اکبر اور جہاں گیر کی پالیسیاں گو متحد المقصد تھیں؛ لیکن ایک نہایت اہم فرق تھا۔ اس امر میں دونوں متفق تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق یکساں ہیں اور دونوں پر یکساں حکومت کرنا فرض سلطنت ہے؛ لیکن اکبر کا خیال تھا کہ اس مقصد کے لیے مذہبی جوش اور اثر کا رنگ ہلکا کرنا ضروری ہے؛ اس لیے وہ ہندو، عیسائی، پارسی اور تمام مذہبوں کا ظاہری قالب اختیار کرتا رہتا تھا، وہ صبح کو سورج پر پانی چڑھاتا تھا، شام کو چراغ جلتے آگ کی تعظیم کرتا تھا، حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ کی تصویروں کے آگے سر جھکاتا تھا؛ لیکن جہاں گیر سمجھتا تھا کہ پکا مسلمان، پکا متعصب، پکا دیندار رہ کر بھی غیر مذہب والوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق دیے جاسکتے ہیں، اس بنا پر وہ ایک طرف تو پنڈتوں سے مذہبی مباحثہ کرکے ان کو قائل کرتا ہے، ایک ہندو راجہ کو ہدایت وتلقین، نہ بہ جبر مسلمان کرتا ہے، کوٹ نگر فتح کرکے اسلامی شعار جاری کراتا ہے، اس پر ناز کرتا ہے، دوسری طرف راجہ مان سنگھ بنگالہ کا گورنر مقرر کرکے پچاس ہزار فوج کا افسر مقرر کرتا ہے، راجہ جگناتھ کو ''پنج ہزاری'' منصب کے ساتھ خلعت اور مرصع تلوار عنایت کرتا ہے ''رانا شنکر'' کو جو مہارانا ''اددے'' کا چچازاد بھائی تھا، خلعت دے کر ''اودے پور'' کی مہم پر بھیجتا ہے، تیرداس کو بکر ماجیت کا خطاب اور میر آتشی کا عہدہ دے کر پچاس ہزار توپچیوں کا افسر مقرر کرتا ہے، شیخ عبدالحق دہلویؒ کی جس طرح تعظیم وتکریم کرتا ہے ''جدروپ گسائیں'' کے ساتھ اسی اعزاز، خلوص اور احترام کے ساتھ پیش آتا ہے، اس کی تمام تاریخ میں

ایک واقعہ بھی منقول نہیں کہ اس نے مذہب کی بنا پر ملکی حقوق کی تفریق کی ہو، اس نے اکبر کی پالیسی کی مداحی ان لفظوں میں کی ہے، اور اس حد تک خود پیرو تھا'' ان کے ممالک محروسہ میں جو دریائے شور پر جا کر ختم ہوتے تھے، مختلف ملتوں کے عقیدوں کی جگہ تھی، خواہ وہ صحیح ہوں یا ناقص، تعرض کی تمام راہیں بند تھیں، ایک مسجد میں شیعہ وسنی اور ایک کلیسا میں فرنگی اور یہودی عبادت کرتے تھے

زمینِ عشق بہ کونین صلح کردیم

(مقالات شبلیؒ، ج:۴، ص:۱۱۸۔۱۱۷)

ڈاکٹر بنی پرشاد (سابق پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی) نے انگریزی میں ہسٹری آف جہانگیر لکھی ہے، جو عام طور سے بہت پسند کی گئی اور مقبول ہوئی، اس میں لکھتے ہیں:

'' موجودہ دور کے بعض (اہل قلم، مراد انگریز مورخین) نے جہانگیر کو سنگ دل، غیر متوازن، ظالم، شراب خور اور عیاش بنانے کی کوشش کی ہے؛ لیکن ایسی رائے انصاف اور صحیح مطالعے پر مبنی نہیں ہے، اس کی شہرت، اس کے باپ کے غیر معمولی کارنامے اور اس کے بیٹے شاہ جہاں کی شان وشوکت کے سامنے ماند پڑ گئی ہے، اس کی شہرت کو تاریخ کی جعلی باتوں اور سیاحوں کے قصوں نے بھی نقصان پہونچایا ہے، اگر اس کی زندگی کے پورے کارناموں کا جائزہ لیا جائے، تو ظاہر ہوگا کہ وہ بڑا ہی باشعور اور رحم دل تھا، اس کو اپنے خاندان کے لوگوں سے گہرا تعلق رہا اور تمام لوگوں کے لیے فیاض تھا، ظلم سے نفرت کرتا، اور انصاف کے لیے بے چین رہتا، اس کی شاہ زادگی اور بادشاہت کے زمانے میں کچھ مثالیں ایسی ضرور ملیں گی کہ اس نے غصے میں آ کر وحشیانہ مظالم کیے؛ لیکن ایسے موقع پر بھی اسے اشتعال دلایا گیا، تب ہی وہ ناروا حرکتیں کر بیٹھا؛ لیکن عام طور سے اس میں بڑی انسانیت، مروت اور دست کشائی رہی۔''

اس نے عیسائی مبلغوں کو اپنی سلطنت میں تبلیغ کرنے کی عام اجازت

دے رکھی تھی، اس نے اپنے سکّوں پر کلمہ ضرور نقش کرایا؛ لیکن ایسے سکے صرف دو تین سال تک جاری رہ سکے، اگر چند مثالوں کو نظر انداز کر دیا جائے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی مذہبی پالیسی مکمل رواداری پر مبنی تھی، اس نے اپنی تزک میں صلح کل کی پالیسی تعریف کی ہے، اور اسی پر عمل کرتا رہا، جیسا کہ اس کے باپ نے کیا تھا، یہ جہاں گیر کی مذہبی غیر رواداری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

(ہسٹری آف جہانگیر ۱۹۳۰ء ایڈیشن، باب:۳۲، بہ حوالہ مذہبی رواداری، ۱۴۱، تا ۱۴۳)

عدل جہانگیری

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر ۞ ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آ نکلا ۞ گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا ۞ خاک کا ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور وکفن
ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہنچی یہ خبر ۞ غیظ سے آ گئی ابروئے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حسن سے بیگم نے بہ صد ناز کہا ۞ میری جانب سے کرو عرض بہ آئین حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں ۞ مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ ''بزن''

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حُسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

مفتیِ دین سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا ۞ کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیِ دین نے بے خوف وخطر صاف کہا ۞ شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرّا اُٹھے ۞ پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر ۞ پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر ورسن

پھراسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں ❁ اور جلاّد کو دیں حکم کہ ''ہاں تیغ بزن''
یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی ❁ تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیِ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ ❁ جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور ❁ نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
اب وہی پانوں ہر اک گام پہ تھرّاتے ہیں ❁ جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام ❁ خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن
مفتیِ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا ❁ بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ وزن
وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے ❁ سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رُک جائے تو ہے مستحسن

(نظم: علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، روشن مستقبل، ص:۵۸)

شاہ جہاں کی رواداری

ابو المظفر محمد شہاب الدین شاہ جہاں (حکومت: ۱۶۲۷ء تا ۱۶۶۵ء) کی مذہبی رواداری کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا، کہ اس نے اپنے راج پوت اور ہندو فوجی سرداروں پر وہی اعتماد کلی رکھا، جو اس کو اپنے مسلمان فوجی منصب داروں پر تھا، بلخ بدخشاں اور ایران میں جو فوجیں بھیجی گئیں ان میں مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ راجپوت، سردار، مثلاً راجہ جسونت سنگھ، راجہ دیبی سنگھ، راجہ روپ سنگھ، چندر اوت، راجہ رائے سنگھ سیسودیہ، راجہ روپ سنگھ راٹھو، وغیرہ تھے، وہ اپنے مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ اس مہم میں دوش بہ دوش رہ کر شریک ہوئے اور

کسی لمحہ یہ محسوس نہیں کیا، کہ وہ اس شاہی فوج کے اجزاے لاینفک نہیں ہیں، چھوٹی بڑی لڑائیوں میں راجپوت سرداروں کی نگرانی میں مسلمان لشکر ہی بلا تکلف رکھ دیے جاتے اور راجپوت لشکری مسلمان فوجی سرداروں کے ماتحت ہو کر اپنی معرکہ آرائی کا ثبوت دیتے، وہ ہندو راجاؤں کے خلاف فوجی مہم میں اسی طرح شریک تھے، جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف کسی مہم میں شریک ہوتے، یہ مغل باشاہوں کے عملِ تسخیر کا نتیجہ تھا:

شاہ جہاں پر یہ الزام ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مندروں کا انہدام کیا، عبدالحمید لاہوری نے بھی ''بادشاہ نامہ'' میں لکھا ہے کہ شاہ اپنے ساتویں جلوس میں شاہی لشکر کے ساتھ گجرات (پنجاب) پہونچا تو وہاں اس سے شکایت کی گئی کہ وہاں کے کچھ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے یہاں ڈال رکھا ہے اور کچھ مسجدوں کو شہید کر کے ان کی جگہ پر مندر بنالیے ہیں، شاہ جہاں نے شاہی فرمان جاری کر کے مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے یا تو نکال لیا، یا یہ کہا کہ ان کا نکاح پھر سے باضابطہ طور پر اسلامی طرز سے ہو اور پھر ان مندروں کی جگہوں پر مسجدیں تعمیر کرائیں جہاں مسجدوں کو شہید کر کے مندر بنائے گئے تھے۔ (بادشاہ نامہ، ج:۱/حصہ دوم، ص:۵۷)

اگر مغل حکمرانوں کا مسلک مندر بند کرنا ہوتا تو آگرہ اور دہلی کے پاس خصوصاً متھرا میں کوئی بھی مندر اس وقت نظر نہیں آتا، وہاں اب بھی ایسے مندر موجود ہیں جو مغلوں کے دور سے بہت پہلے بنائے گئے تھے، موجودہ دور میں مندروں کے انہدام کو ایک سیاسی مسئلہ اس لیے بنادیا گیا ہے، کہ اس قسم کے واقعات سے جذباتی طور پر ہندو مسلمان میں اختلاف پیدا کیا جائے۔ (مذہبی رواداری، ص:۲/۱۰۹)

اگر شاہ جہاں نے مندر منہدم کیے تو مجموعی حیثیت سے ہندوؤں میں شاہ جہاں کے خلاف کوئی نفرت نہیں پھیلی، ہندو اور راجپوت دونوں اس کے دربار سے منصب پا کر اس کے وفادار بنے رہے، اس عہد کے سنسکرت زبان کے شعراء بھی

اس کے اوصاف میں نغمے الاپتے رہے، اس زمانہ کا ایک سنسکرت شاعر ''جگناتھ پنڈت راج'' اس کی شان میں کہتا ہے:

''اے بادشاہ شہاب الدین (شاہ جہاں)! یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص دنیا میں موجودہ زمانے میں نہ گذشتہ میں آپ کی لیاقت کے برابر ہوا، اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، اگر خالق دنیا پھر سے نئی چیزوں کو پیدا کرے تو بھی کوئی کسی لحاظ سے آپ کی برابری نہیں کر سکے گا''۔ (مذہبی رواداری، جلد دوم)

شاہ جہاں کا ایک درباری شاعر ہری نرائن مصرا بھی اس کی مدح میں کہتا ہے:

''ایک بڑے اور بھاری بادل نے ایک بلند پہاڑی کی اونچی چوٹی پر برسنا شروع کیا تو اے بادشاہ! سرسوتی کا دریا فتح مند، پُرشور اور پاک وصاف ہوگیا، اے شاہِ جہاں! میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس دریا کی پاکی کی وجہ سے اس میں جو شخص نہاتا ہے اس کا سر کنول کی طرح چمکیلا اور روشن ہو جاتا ہے، اس کے بال شہد کی مکھی کی طرح ہو جاتے ہیں''۔

بادل سے مراد شاعر ہے اور بلند پہاڑ کی اونچی چوٹی خود بادشاہ کی ذات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کوئی بادشاہ کی تعریف میں شاعر کی شاعری سنتا ہے اس کا چہرہ کنول کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے۔ (ایضاً)

حضرت سلطان اورنگ زیب عالم گیرؒ کی رواداری

اس خاندان کے مشہور تاجدار سلطان محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ (حکومت: ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۸ء) جن کو خاص طور پر بدنام کیا گیا ہے، ان کے عہدِ حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے کپتان ''الیگزنڈر ہملٹن'' اپنے سفرنامے میں شہر ''ٹھٹ'' کے متعلق لکھتا ہے:

''ریاست کا مسلّمہ مذہب اسلام ہے، لیکن اگر تعداد میں دس ہندو ہیں تو

ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری برتی جارہی ہے، وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور اپنے تیوہاروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانے میں منایا کرتے تھے، جب کہ بادشاہت ہندوؤں کی تھی، وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں؛ لیکن ان کی بیواؤں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مُردوں کے ساتھ ستی ہوں۔ پارسی بھی ہیں اور وہ اپنی رسوم مذہب زردشت کے بہ موجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں؛ لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق شہر کے تمام لوگوں سے اکثر بدتر ہو جاتے ہیں''۔ (خطبۂ صدارت سولہواں اجلاس عام جمعیت)

شہر سورت کے متعلق لکھتا ہے:

''اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، لیکن ان میں کسی قسم کے جھگڑے ان کے اعتقادات وطریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلافِ مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے''۔ (ایضاً)

یہی عالم گیرؒ ہیں جس کے اعلیٰ حکام میں ایک کثیر تعداد معزز خاندان کے ہندوؤں کی شریک حکومت ہے، حتیٰ کہ خالص مسلم آبادی کے صوبہ ''افغانستان'' کا گورنر بھی ایک ہندو راجپوت ہی ہے۔ یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب کہ پورے ہندوستان کے اندر ایک عظیم الشان سلطنت قائم تھی۔ ان بادشاہوں اور راجاؤں کے یہی مسلمہ اصول تھے جو اس زمانہ میں بھی جاری رہے، جب ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ٹیپو سلطان کا معتمد سردار پورنیان برہمن تھا۔ ڈبلو ایم ٹارانس اپنی کتاب ''ایشیا میں شہنشاہیت'' میں لکھتا ہے:

''شیواجی کو متعصب اور سلطان ٹیپو کو کٹّر مذہبی کہا جاتا ہے؛ لیکن جس وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا، اس وقت ان کے یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصوں میں مخلوق کو تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا، جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک نہ اپنے بزرگوں کی جاگیر کا حق دار سمجھا جاتا تھا، نہ فوج کا افسر ہو سکتا تھا، جب سویڈن میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدے کا کوئی ملازم نہیں ہوسکتا تھا، اس وقت ہندوستان کے اندر اس کے ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت حاصل کرنے، سرمایہ کمانے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں آزاد تھے''۔ (خطبات صدارت جمعیۃ علماء ہند)

پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی نے اس دور میں مکمل مذہبی کی تصدیق حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

''اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لیے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی، ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں۔ جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کیے جانے کا تذکرہ ہے۔

اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں، جن میں سے ایک اریل میں شومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے''۔ (ماخوذ از مضامین بابو سندر لال، مصنف ''بھارت میں انگریزی راج'' مندرجہ استقلال دیوبند مورخہ ۴؍مارچ ۱۹۲۶ء)

''اسی طرح شہنشاہ اورنگ زیب نے گردھر پسر جگ جیون ساکن موضع بسی

ضلع بنارس اور جدمصر ساکن مہیش پور پرگنہ حویلی کو اور پنڈت لمبھد رمصر کو جاگیریں عطا کیں''۔ (مرقع بنارس، از خان بہادر چودھری نبی احمد صاحب، ص:۱۶۴)

اسی طرح مسٹر چارلس گرانٹ نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ:

''مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانے میں ہندوؤں کے کیریکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی؛ بلکہ اُن کے حال پر اُنہیں چھوڑ دیا تھا''۔ (تاریخ التعلیم از سید محمود، ص:۱۳۰)

پارلیمنٹ میں پروفیسر بشمبر ناتھ پانڈے کی ایک تاریخی تقریر

یہاں پر ہم ہندوستان کے راجیہ سبھا کی اس تقریر کا خلاصہ بھی پیش کرتے ہیں، جو پروفیسر بی این پانڈے نے ۲۹؍جولائی ۱۹۷۷ء میں کی تھی، وہاں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کا نصاب کیسا ہو، کہ جس سے ثقافتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو، اس سلسلے میں انہوں نے بڑی لمبی تقریر کی جس کے کچھ حصے ہدیۂ ناظرین ہیں:

''بدقسمتی سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں گذشتہ کئی نسلوں سے جو کتابیں پڑھائی جارہی ہیں وہ وہی ہیں جو یورپی مصنفوں کی لکھی ہوئی ہیں اور یورپی اساتذہ نے جو کچھ پڑھایا ہے اس کے اثرات کو ہندوستانی اب تک دور نہیں کر سکے ہیں، ایسی لکھی ہوئی تاریخوں سے جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ ہماری قومی زندگی کے سرچشمے کو آلودہ کیے ہوئے ہیں، ان کتابوں میں ایسے اختلافات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کہ ہندو مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کر کے لوٹ مار کرتے، اور مذہبی تعصب دکھاتے، ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا ہے، کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایات کو تہس نہس کرنے میں مشغول رہے، ان

کے مندر اور محلوں کا انہدام کیا، ان کی مورتیاں توڑیں اور ان کے سامنے یہ خوف ناک شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبول کرو ورنہ تلوار استعمال کی جائے گی، پھر یہ چیزیں زندگی کے اس زمانے میں پڑھائی جاتی ہیں، کہ جب ذہن پر کسی چیز کا گہرا اثر پڑ جاتا ہے تو اس کا دور ہونا مشکل ہو جاتا ہے؛ اس لیے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو شک وشبہ کے نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے اور ان میں باہمی بداعتمادی پیدا ہو گئی، ہندو یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے، کہ مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومتیں محض ہوا تھیں، وہ مسلمانوں کی تاریخ پر کوئی فخر محسوس نہیں کرتے؛ بلکہ اس کو نظر انداز کر کے اپنی قدیم تاریخ ہی سے سب کچھ سیکھنا چاہتے ہیں پھر اسی کو زریں دور سمجھ کر اس کی مدح سرائی کرنے لگتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں سے جب مغرب کی ایک عیسائی قوم نے اس کے قوت واقتدار کو چھینا اور ہندوان کو حملہ آور سمجھنے کے عادی ہو گئے تو وہ اپنی خودداری اسی میں تصور کرنے لگے، کہ یہاں کی تاریخ میں ان کے مذہبوں نے جو شاندار کارنامے انجام دیے ہیں ان پر فخر کرتے ہیں اور اس سے پہلے کی تاریخ نظر انداز کر دیتے ہیں، جس کے سہارے ان کے تمدنی کارنامے ظہور پذیر ہوئے؛ حالاں کہ ان کو یہاں کی قدیم تاریخ پر بھی فخر کرنا چاہیے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان جذبات کو بھڑکانے میں انگریز مورخوں نے بڑی مدد فرمائی۔ سرایچ، ایم ایلیٹ کی تاریخ ''ہسٹری آف انڈیا از ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریز'' مشہور ہے، اس کی پہلی جلد کے عمومی پیش لفظ میں یہ درج ہے:

''ہم ایسے بادشاہوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو کاہلی اور عیاشی میں مبتلا رہے، ان کے گناہ ''کالی گولا'' اور ''کلوڈس'' سے بھی بڑھے ہوئے تھے''۔

ایسے بادشاہوں کے حالات میں اگر ہم یہ پڑھیں تو تعجب نہ کریں کہ ان کے یہاں انصاف کا سرچشمہ بالکل ہی پراگندہ تھا، ریاست کے محصولات تشدد

اور ظلم سے وصول کیے جاتے، گاؤں میں آگ لگادی جاتی، لوگوں کے جسمانی حصے کاٹ دیے جاتے، ان کو غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا جاتا، جو سرکاری عہدے دار ہوتے وہ ان کے محافظ کیا ہوتے، کہ وہ خود ڈاکو، غاصب اور سوسائٹی کے مجرم بن جاتے، صوبوں سے مال لوٹ کر آتا تو محل کے خواجہ سرا ان سے فائدہ اٹھاتے، غرباء کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔

اس پہلی جلد کے مختصر اقتباسات کی جھلک سے معلوم ہوگا، کہ ہندو اگر مسلمانوں سے جھگڑا کرتے تو وہ قتل کر دیے جاتے، ان کے لیے مذہبی جلوس نکالنا، اشنان کرنا ممنوع تھا، ان کے خلاف طرح طرح کے غیر روادارانہ اقدام کیے جاتے، ان کی مورتیوں کو مسخ اور ان کے مندروں کو منہدم کر دیا جاتا، ان کو زبردستی مسلمان بنالیا جاتا، ان کی لڑکیوں سے زور وظلم سے شادی کر لی جاتی، ان کی جائدادیں ضبط ہو جاتیں، قتل عام رہتا، ایسے ظالم اپنی عیاشی اور شراب نوشی میں مست رہتے، ان کی مرقع آرائی مبالغہ سے نہیں کی گئی ہے''۔

اس کے ساتھ برطانوی حکومت کے دستاویزات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' پر کس کس طرح سے عمل کیا۔ لارڈ الگن کے زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ ووڈ نے اس کو ایک خط مورخہ ۳/ مارچ ۱۸۶۲ء میں لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کر رکھا ہے، کہ ہم ایک دوسرے کو مخالف بناتے رہے ہیں اور اس عمل کو جاری رکھنا چاہیے، اس کے لیے جہاں تک ممکن ہے اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ یہاں کے لوگوں میں مشترکہ جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔ مئی ۱۸۶۲ء میں اسی ووڈ نے لارڈ الگن کو پھر لکھا کہ ہمارے خلاف جو مخالفت ہو اس کو مضبوط بننے نہ دیا جائے اور اس کو یقینی جانیں، کہ وہاں کے لوگوں میں ایک دوسرے سے لڑائی ہوگی تو وہ ہمارے لیے قابل اعتنا قوت ہوگی، اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں؟

۲۶/مارچ ۱۸۸۶ء کوایک دوسرے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہملٹن نے لارڈ کرزن کولکھا کہ میرے خیال میں ہندوستان میں ہماری حکومت کو ابھی خطرہ نہیں ہے؛ لیکن پچاس برس کے بعد یہ خطرہ ضرور سامنے آئے گا، جب مغربی طرز کی شورش پسندی اور تنظیم کی قوت ابھرے گی؛ لیکن ہم لوگ ان تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیں اور یہ دونوں اپنے خیالات میں کافی مختلف ہوں آئندہ تعلیم کے پھیلنے سے ہماری حکومت پر تیز اور مسلسل حملے ہوں گے؛ لیکن ہم ہندوستانیوں میں تفرقہ پیدا کرتے رہیں، تو اس سے ہماری حکومت مضبوط رہے گی، اس لیے ہم تعلیمی اداروں میں نصاب کی کتابیں ایسی پڑھائیں، کہ یہاں کے مختلف فرقوں کے درمیان تفرقے کی مضبوطی پیدا ہوتی رہے۔

۱۴/جنوری ۱۸۸۷ء کو اس نے گورنر جنرل ڈفرن کولکھا کہ یہاں کے لوگوں میں مذہبی اختلافات کا پیدا کرنا ہمارے فائدے کے لیے ہے، اور آپ نے جو ہندوستانی تعلیم اوراس کے نصاب کی تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہے۔

اسی طرح ایک خاص پالیسی کے ماتحت ہندوستان کی تاریخ کے متعلق نصاب کی کتابیں تیار کی گئیں اور واقعات توڑ مروڑ اور جھٹلا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ میں مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں پر بڑے مظالم کیے، ان کو اسلامی حکومت میں خوف ناک ذلتیں برداشت کرنی پڑیں اوران دونوں فرقوں کی معاشرتی، سیاسی، اقتصادی زندگی میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہیں تھیں۔

سلطان ٹیپو علیہ الرحمہ پر بے بنیاد الزام کی حقیقت

پروفیسر بی، این پانڈے نے بہت سی اور باتیں بیان کرکے کہا: جب میں ۱۹۲۸ء میں الہ آباد میں ٹیپو سلطانؒ پر ریسرچ کررہا تھا، تو وہاں کے اسکول کے کچھ

طلبہ نے میرے پاس آکر اپنی ہسٹری ایسوسی ایشن کے افتتاح کرنے کی دعوت دی، وہ اسکول سے میرے پاس آئے تھے، ان کے ساتھ ان کے نصاب کی کتابیں تھیں، میں نے اتفاقاً ان کی تاریخ کی ایک کتاب پر نظر ڈالنی شروع کی، اس میں ٹیپو سلطانؒ پر ایک باب تھا، اس کو پڑھنا شروع کیا، تو اس کے بعض جملوں کو پڑھ کر کھٹک پیدا ہوئی۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ تین ہزار برہمنوں نے محض اس لیے خودکشی کرلی کہ ٹیپو ان کو زبردستی اسلام کے دائرے میں لانا چاہتا تھا، اس کتاب کو ترتیب دینے والے مہامہا پادھیا ڈاکٹر ہر پرشاد شاستری صدر شعبۂ سنسکرت کلکتہ یونیورسٹی تھے، میں نے فوراً ڈاکٹر شاستری سے اس بیان کی سند کا حوالہ دریافت کیا، ان کو کئی خطوط لکھے، تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ میسور گزیٹیر سے لیا گیا ہے، یہ گزیٹیر مجھ کو نہ الہ آباد اور نہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں ملا، اس وقت میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر سرہری چند ناتھ سبل تھے، میں نے ایک خط کے ذریعے ان سے اس واقعے کی تصدیق چاہی، انہوں نے میرے خط کو پروفیسر سری کانتیا کے پاس بھیج دیا جو اس وقت میسور گزیٹیر کا نیا ایڈیشن مرتب کررہے تھے انہوں نے مجھ کو لکھ بھیجا، کہ میسور گزیٹیر میں ایسا کوئی واقعہ درج نہیں ہوا، یہ بھی لکھا کہ وہ میسور کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میسور میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، یہ بھی لکھا کہ ٹیپو سلطان کا وزیر اعظم ایک برہمن مسمی پونیا تھا اوراس کا فوجی سپہ سالار بھی کرشنا راؤ نامی برہمن تھا، پھر انہوں نے میسور کے ایک سو چھپن مندروں کی فہرست بھی بھیجی، جن کو ٹیپو سلطان سالانہ امداد دیا کرتا تھا، ٹیپو کے بڑے خوش گوار تعلقات میسور کے سری نگری مٹھ میں جگد گرو شنکرا چاریہ سے تھے، ٹیپو نے ان کو جو خطوط لکھے تھے، ان میں سے تیس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بھی جواب کے ساتھ منسلک کردی تھیں، میسور کے فرماں رواؤں کا معمول تھا کہ سرنگا پٹنم کے اندر جو رنگا ناتھ مندر ہے، وہاں وہ جایا کرتے تھے، ٹیپو سلطان بھی صبح کے ناشتے سے پہلے وہاں

روزانہ جایا کرتا تھا، پروفیسر سری کانتیا نے یہ بھی لکھا ہے ڈاکٹر شاستری نے شاید یہ واقعہ کرنل مائکس کی ہسٹری آف میسور سے لیا ہو، جنھوں نے فارسی کے ایک مخطوطہ "تاریخ ٹیپو سلطان" کا ترجمہ کیا ہے، یہ مخطوطہ ملکہ وکٹوریہ کے کتب خانے میں نہیں ہے، کرنل مائکس کی تاریخ میں سارے واقعات من گھڑت اور جھوٹے ہیں، ڈاکٹر شاستری کی کتاب بنگال، آسام، بہار، اڑیسہ، یوپی، ایم پی اور راجستھان کے اسکولوں کے نصاب میں داخل تھی، میں نے کلکتہ یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر آشوتوش مکرجی سے خط وکتابت کی اور سارے واقعات لکھ بھیجے، تو انہوں نے اس کتاب کو نصاب سے نکلوادیا؛ لیکن مجھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یوپی کے جونیر اسکولوں کے نصاب کی کتاب میں ۱۹۷۲ء میں بھی یہ واقعہ دہرایا گیا۔

حضرت اورنگ زیبؒ کی جانب سے مندروں کے لیے جاگیریں

اسی طرح جب میں الہ آباد میونسپلٹی کا چیرمین تھا، تو ایک داخل خارج کا مقدمہ میرے سامنے پیش کیا گیا جو "سمیشور رناتھ" مہادیو مندر کی جاگیر کے جھگڑے کے سلسلے کا تھا، اس کے مہنت کی وفات کے بعد اس جاگیر کے دو دعوے دار ہوگئے، ایک نے ایسی دستاویز پیش کی جو اس کے خاندان میں محفوظ چلی آرہی تھی، یہ اورنگ زیب کا جاری کردہ فرمان تھا، جس کی رو سے مندر کو ایک جاگیر اور کچھ نقدی عطا کی گئی تھی، اس کو دیکھ کر میں سراسیمہ ہوا، خیال آیا کہ یہ فرمان جعلی ہے؛ کیوں کہ اورنگ زیب تو برابر مندر منہدم کراتا رہا، وہ یہ لکھ کر کیسے فرمان جاری کرسکتا تھا کہ یہ جاگیر مندر کے دیوتا کے پوجا اور بھوگ کے لیے ہے، وہ اس بت پرستی میں اپنے کو کیسے شریک کرسکتا تھا؛ مگر کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے میں سر تیج بہادر سپرو کے پاس ان سے مشورے لینے کے لیے چلا گیا، وہ فارسی اور عربی اچھی طرح جانتے تھے، میں نے یہ فرمان ان کے سامنے رکھ دیا، اس کا مطالعہ کرکے انھوں نے فرمایا کہ یہ اصلی ہے، جعلی نہیں ہے، اس کے بعد انہوں

نے اپنے منشی سے جنگم باڑی شیو مندر کے اس مقدمے کا فائل طلب کیا، جو الہ آباد ہائی کورٹ میں گذشتہ ۱۵/ برس سے چل رہا تھا، جنگم باڑی شیو کے مندر کے مہنت کے پاس بھی اورنگ زیب کے ایسے مختلف فرامین تھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ اس مندر کے لیے جاگیر دی گئی، ان کو دیکھ کر اورنگ زیب کی ایک نئی تصویر میرے سامنے آئی اور میں بالکل متحیر سا رہ گیا، ڈاکٹر سپرو کے مشورے کے مطابق میں نے ہندوستان کے مختلف اہم مندروں کے مہنتوں کو خطوط لکھے کہ اگر اورنگ زیب نے ان کے مندروں کو کچھ جاگیر دی ہیں، تو اس کے فرامین کے فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ان کے پاس بھیج دی جائیں، میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب گوہاٹی، مہاکلیشور، جین، بالاجی مندر، چترکوٹ اور اوما نند گوہاٹی، شرزرن، جے کے، جین مندروں اور اسی طرح شمالی ہند کے دوسرے مندروں اور گردواروں کی طرف سے مجھ کو ایسے فرامین کی نقلیں ملیں جو ۱۰۶۵ھ یعنی ۱۶۵۹ء سے لے کر ۱۰۹۱ھ یعنی ۱۶۸۵ء کے درمیان جاری کیے گئے تھے۔

ہندوؤں کے ساتھ اورنگ زیب کا فیاضانہ سلوک رہا ہے اس کی محض تھوڑی سی مثالیں ہیں، ان سے ظاہر ہوگا کہ اورنگ زیب کے متعلق مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کس قدر تعصب ہے اور یہ محض ایک رخ کی تصویر ہے، ہندوستان بہت وسیع ملک ہے، یہاں ہزاروں مندر ہیں اگر پورے طور پر تلاش وتحقیق کی جائے تو مجھ کو یقین ہے کہ اور بھی بہت سی مثالیں ملیں گی، اور پھر اندازہ ہوگا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اورنگ زیب کا سلوک کیسا کریمانہ رہا۔

مندروں کے انہدام کا الزام اور اس کی حقیقت

اورنگ زیب نے بلاشک وشبہ وارانسی کے وشواناتھ اور گولکنڈہ کی جامع مسجد کو مسمار کیا؛ لیکن اس مندر اور مسجد کے منہدم کرنے کے اسباب معلوم ہوں گے، تو پھر اصلی صورت حال کی نوعیت ظاہر ہوگی، وشواناتھ مندر کے برباد کرنے کا قصہ یہ ہے کہ

اورنگ زیب بنگال جارہا تھا تو وارانسی کے پاس سے بھی گذرا، اس کے جلوس میں ہندوراجے بھی تھے، انہوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ سفر میں ایک روز قیام کیا جائے؛ تاکہ ان کی رانیاں وارانسی جاکر گنگا میں اشنان اور وشوناتھ جی کی پوجا کرسکیں اورنگ زیب اس کے لیے فوراً راضی ہوگیا، وارانسی ۵رمیل دور تھا، فوج متعین کردی گئیں، رانیاں پالکیوں سے روانہ ہوئیں، انہوں نے گنگا میں اشنان کیا اور وشواناتھ مندر میں پوجا کے لیے گئیں اور رانیاں واپس آئیں؛ مگر کچھ کی مہارانی لاپتہ تھیں، ہرطرف اس کی تلاش ہوئی، کہیں پتہ نہیں چلا، اورنگ زیب کو اس گم شدگی کی اطلاع ہوئی، تو بہت برہم ہوا، اس نے رانی کی تلاش میں اپنے اونچے عہدے داروں کو بھیجا، انہوں نے دیکھا کہ گنیش کی مورتی دیوار میں نصب ہے؛ لیکن اس میں حرکت ہوتی رہتی ہے، یہ مورتی اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے زینے تھے، جو ایک تہ خانے میں جاتے تھے، لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے رانی کو اس تہ خانے میں پایا، اس کی عصمت ریزی ہوگئی تھی، اور وہ رورہی تھی، یہ تہ خانہ وشوناتھ مورتی کے ٹھیک نیچے تھا، ہندوراجاؤں نے سخت احتجاج کیا، انہوں نے فریاد کی کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے، بڑا اہم مسئلہ تھا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ پوتر احاطہ ناپاک کردیا گیا ہے، وشواناتھ کی مورتی تو کہیں اور جگہ منتقل کردی جائے؛ لیکن مندر مسمار کردیا جائے، اور مہنت کو گرفتار کرکے سزادی جائے۔

ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ نے اپنی مشہور کتاب ''دی فیدرس اینڈ اسٹونس'' میں اسی واقعے کو پوری سند کے ساتھ لکھا ہے اور ڈاکٹر پی، ایل گپتا نے بھی جو پٹنہ میوزیم کے سابق کیورس تھے، اس کو دہرایا ہے۔

گولکنڈہ کا حکمراں تاناشاہ کے نام سے مشہور ہے، وہ اپنی ریاست کے محصولات کو وصول کرتا؛ لیکن دہلی کچھ نہ بھیجتا، چند برسوں کے اندر کروڑوں کی رقم جمع ہوگئی، تاناشاہ نے اس کو زمین کے اندر دفن کردیا اور اس کے اوپر ایک جامع

مسجد بنادی گئی، اورنگ زیب کو اس کی خبر ہوئی، تو اس نے مسجد کو مسمار کرادیا، اور خزانے کو ضبط کرکے رفاہِ عام میں صرف کردیا۔ یہ دو مثالیں ایسی ہیں، جن سے ظاہر ہوگا کہ اورنگ زیب صحیح فیصلہ کرنے میں مندر اور مسجد کی تفریق نہیں کرتا تھا۔

شیواجی کے مسلمان عہدے داران

ڈاکٹر بی، این، پانڈے نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ شیواجی کے پرائیویٹ سکریٹری شیخ صدر قاضی تھے، جو اس کے تمام دستاویزات محفوظ رکھتے اور اس کی طرف سے خط وکتابت کرتے، سدی حنبل اور سدی بلال اس کے دوفوجی سردار مسلمان تھے، اور اس کی بحری فوج کا سردار بھی ایک مسلمان تھا، شیواجی دہلی کی مرکزی حکومت کے خلاف نہیں تھا، یہ ان مراسلات سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس نے اورنگ زیب کو لکھے تھے، اور پارس نیس لائبریری میں اب تک محفوظ ہیں، وہ کچھ رعایتیں چاہتا تھا اور وہ یہ تھیں کہ اس کو چوتھ وصول کرنے اور اپنا سکہ ڈھالنے کا حق دیا جائے، شیواجی کا دادا تو مسلمان بزرگ شاہ شرف الدین کا معتقد تھا، ان کے نام پر اس نے اپنے بیٹے کا نام شاہ جی اور چھوٹے کا شرما جی رکھا، خود شیواجی کو کلسی کے مسلمان بزرگ باباقوت سے بڑی عقیدت تھی۔

اکبر اور رانا پرتاپ سنگھ کے کمانڈر

رانا پرتاپ سے اکبر کی جولڑائی ہلدی گھاٹ میں ہوئی وہ کسی طرح مذہبی جنگ نہ تھی، اس میں اکبر کی طرف سے چالیس ہزار راجپوت اور ساٹھ ہزار مغل لشکری تھے اور ان کی کمان راجہ مان سنگھ کررہا تھا، اسی طرح رانا پرتاپ کی فوج میں بہت سے پٹھان تھے، اس کے ایک دستہ کی کمان حکیم خان سور کے ہاتھ میں تھی، جلور کا پٹھان راجہ تاج خاں ایک ہزار سواروں کے ساتھ رانا پرتاپ کی حمایت میں لڑرہا تھا، رانا

پرتاپ کی فوج میں چالیس ہزار راجپوت تھے، راجپوت، راجپوت اور پٹھان پٹھان کے خلاف لڑ رہے تھے، پھر اس لڑائی کو ہم اسلام اور ہندومت کی لڑائی کیسے کہہ سکتے ہیں، یہ مرکزی اور علاقائی اور قوتوں کا تصادم تھا، رانا پرتاپ اس تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ اپنی بہادری سے اپنی آزادی کو قائم رکھنا چاہتے تھے؛ لیکن کسی حال میں ان کی لڑائی کو ہم اسلام اور ہندومت کی لڑائی نہیں کہہ سکتے۔

اور بہت سی باتیں بیان کر کے ڈاکٹر بی، این، پانڈے نے کہا کہ ایسے واقعات تاریخ میں نہیں پڑھائے جاتے؛ لیکن ضرورت ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں نہ لکھی جائیں، جن سے یہاں کے لوگوں میں عداوت اور منافرت پیدا ہو۔

(اس تقریر میں جو تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کے مستند ہونے کی ذمہ داری پروفیسر موصوف ہی پر ہے۔) (مذہبی رواداری، ج:۳، ص:۳۱۲ تا ۳۲۱)

حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمہ کی شیواجی کے ساتھ رواداری

اورنگ زیبؒ کی لڑائی شیواجی سے ہوئی، تو انہوں نے اس کا محاصرہ کرلیا، وہ قلعہ میں بند تھا، اتفاق سے اس کے پاس راشن ختم ہوگیا، (محاصرے کے سبب راستہ کوئی راشن لانے کا نہیں تھا) اس لیے اس نے اپنی ماں سے مشورہ کیا، کہ کیا کرنا چاہیے، اس نے جواب دیا کہ عالم گیر سے مشورہ کرلے، اس نے کہا کہ عالم گیر تو میرے خون کا پیاسا ہے، اس سے کیسے مشورہ کروں، اس کی والدہ نے کہا یہ تو صحیح ہے ؛لیکن وہ اپنے مذہب کا پختہ ہے اور اس کے مذہب میں یہ ہے کہ جب کوئی مشورہ لے تو صحیح مشورہ دینا چاہیے، اس لیے وہ صحیح مشورہ دے گا، اس پر اس نے قلعہ پر سے جھنڈی دکھلائی جس سے اشارہ تھا کہ میں ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں، اس کے بعد اس نے کہا کہ میرے پاس راشن ختم ہوگیا، میں کیا کروں؟ کوئی راستہ نہیں ہے کہ جس سے لایا جاسکے، اورنگ زیب نے جواب دیا کہ مصالحت کر کے جنگ بند کردو،

اور زمانۂ مصالحت میں انتظام کرلو، اس کے بعد جنگ کرنا، اس نے پوچھا کتنی مہلت دے سکتے ہو، جواب دیا کہ دس برس کی، اس کو حیرت ہوئی اور اس نے صلح کرلی، اورنگ زیب نے اپنی فوج ہٹالی، کسی نے پوچھا کہ دس سال کی مہلت کیوں دی؟ جواب دیا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر کافروں کی حضور اقدس ﷺ سے دس سال کے لیے ہی مصالحت ہوئی تھی اور کامیابی اتباع سنت ہی میں ہے؛ اس لیے میں نے بھی دس برس تک کے لیے مصالحت کی ہے؛ مگر شیواجی نے دس سال سے پہلے ہی غداری کی تب اس کے ساتھ لڑائی ہوئی، جس میں وہ گرفتار کر کے دلی لایا گیا؛ مگر (اس کے باوجود) اورنگ زیب نے اس کو قتل نہیں کیا۔ (اسلامی اخلاق، ص:۵۷۰)

مغل حکمرانوں کے دور میں تعلیم اور ملازمتوں میں رواداری

مغل حکمرانوں کے زمانے میں ملک میں ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام بغیر کسی فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا۔ نیز عہدوں کی تقسیم میں قوم و مذہب کا کوئی سوال نہ تھا اور کوئی زمانہ ایسا نہ تھا جس میں ہندو راجاؤں کے یہاں مسلمان وزیر اور گورنر اور مسلمان بادشاہوں کے یہاں ہندو وزیر اور صوبے دار نہ رہے ہوں۔ اس زمانے کی نوکریوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتی تھیں۔ ملازمتوں کے بارے میں شہنشاہ اورنگ زیب کی نسبت مشہور ہے کہ ایک شخص نے انہیں عرضی دی کہ تنخواہ تقسیم کرنے والے دونوں افسر آتش پرست پارسی ہیں، انہیں برخاست کردیا جائے، اس کا جواب یہ ملا کہ:

”سلطنت کے کاروبار میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہیے۔ اگر سائل کی بات پر عمل کیا جائے تو تمام راجاؤں اور ان کی رعایا کا کہاں ٹھکانا ہو، شاہی نوکریاں لوگوں کو اُن کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملنی چاہئیں“۔

(پریچنگ آف اسلام: مسٹر آرنلڈ)

سر ولیم نبیٹنگ جو ابتدا میں مدراس کے گورنر اور اس کے بعد ہندوستان کے مشہور وائسرائے رہے ہیں وہ کہتے ہیں:

''بہت سے اعتبارات سے مسلمانوں کی حکومت ہماری حکومت سے سبقت لے گئی جو ممالک انہوں نے فتح کیے اُن میں وہ رہ پڑے، اُنہوں نے وہاں کے باشندوں کے ساتھ مناکحت کی اور انہیں جملہ حقوق دیے، فاتح اور مفتوح کے منافع اور ہمدردیاں ایک ہوگئیں، اس کے مقابلے میں ہماری حکمت عملی اس کے برعکس رہی، جس میں سرد مہری، خود غرض اور بے حسی تھی''۔ (روشن مستقبل:۵۵)